مناسک حج و عمرہ (احرام، طواف، سعی وغیرہ) کے احکامات، نیز جنایات پر لازم آنے والے کفارے کے حوالے سے دار الافتاء اہلسنت (دعوتِ اسلامی) کی طرف سے جاری شدہ منتخب فتاویٰ کا مجموعہ بنام:

فتاویٰ اہلسنت

حج وعمرہ (حصہ اول)

پیش کش: مجلسِ افتاء (دعوتِ اسلامی)

فہرست

بسمِ اللہ الرَّحمنِ الرَّحیم

پیشِ لفظ:

اللہ رب العزت قرآنِ پاک میں ارشاد فرماتا ہے:﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ، فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ ۚ۬ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ﴾ترجمۂ کنزالعرفان:”بے شک سب سے پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کے لئے بنایا گیا وہ ہے جو مکہ میں ہے برکت والا ہے اور سارے جہان والوں کے لئے ہدایت ہے،اس میں کھلی نشانیاں ہیں، ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے اور جو اس میں داخل ہو گیا امن والا ہو گیا اور اللہ کے لئے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا فرض ہے جو اس تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہے اور جو انکار کرے تو اللہ سارے جہان سے بے پرواہ ہے۔“(1)

ان آیاتِ کریمہ میں اللہ پاک نے کعبہ شریف کی 6صفات بیان فرمائی ہیں، جن میں سے ایک بہت ہی نمایاں نشانی یہ بیان کی گئی کہ اللہ کے اس گھر کا حج کیا جاتا ہے۔ یہ اصل میں قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لیے ایک حکم ہے۔ اللہ پاک ارشاد فرماتا ہے:﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا﴾ ترجمۂ کنز العرفان: ”اور اللہ کے لئے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا فرض ہے جو اس تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہے۔“(2)

1...(پارہ4،سورہ آل عمران، آیت96، 97)

2...(پارہ4،سورہ آل عمران، آیت 97)

یہ کعبہ شریف ہی کی خصوصیت ہے کہ روئے زمین پر اور کہیں بھی حج نہیں ہوتا۔ کعبہ شریف وہ مقدس مقام ہے کہ زمین کی پیدائش سے لے کر قیامت تک اگر کسی کا طواف کیا جاتا تھا، کیا جاتا ہے اور کیا جائے گا، تو وہ کعبہ شریف ہی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حج ہوتا تھا، ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا اور یہ خصوصیت دنیا میں اور کسی بھی مقام کو حاصل نہیں ہے۔ کعبہ شریف ہی وہ مبارک مقام ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام جس کا حج کیا کرتے تھے، الغرض دنیا میں کوئی اور مقام ایسا نہیں ہے کہ جہاں حج ہوا ہو یا آئندہ کبھی ہو سکتا ہو۔

ہر وہ مسلمان جو استطاعت رکھتا ہے یعنی جس کے پاس مکۃ المکرمہ پہنچنے اور واپس آنے کے اخراجات ہیں۔ اپنے پیچھے اہلِ خانہ کے لیے بھی مناسب انتظامات کر سکتا ہے اور راستہ بھی پُر امن ہے اور دیگر شرائط بھی پوری ہیں، تو اس پر حج فرض ہے، اس پر لازم ہے کہ وہ حج کے لیے جائے۔ قرآن و حدیث میں اس کی تاکید اور ترغیب ارشاد ہوئی ہے۔

چنانچہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے اس کی تاکید بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: جو زادِ راہ اور سواری کا مالک ہو، جو اسے بیت اللہ تک پہنچادے اور اس نے حج نہ کیا، تو اس کی پرواہ نہیں چاہے وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی۔ اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا ہے، جو اس تک چل سکے۔[1] اسی طرح نبی پاک صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے اس کی فضیلت و عظمت کے حوالے سے ارشاد فرمایا: حج کرنے والا اپنے گھر والوں میں سے

---

1 ...۔ (جامع الترمذی، جلد 1، صفحہ 100، مطبوعہ ملتان)

400 (مسلمانوں) کی شفاعت کرے گا اور گناہوں سے ایسا پاک ہو جائے گا، جیسا اپنی پیدائش کے دن تھا۔[1] ایک حدیثِ پاک میں ہے: حج کیا کرو، کیونکہ حج گناہوں کو ایسے دھو دیتا ہے، جیسے پانی میل کو دھو دیتا ہے۔[2] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے فرمایا: جب تم کسی حاجی سے مُلاقات کرو، تو اس سے سلام و مصافحہ کرو اور اس سے کہو کہ وہ اپنے گھر میں داخل ہونے سے پہلے تمہارے لیے مغفرت کی دعا کرے، کیونکہ اس کی مغفرت ہو چکی ہے۔[3]

الغرض حج اتنی عظیم اور فضائل کی حامل عبادت ہے، لیکن چونکہ یہ صاحبِ استطاعت پر زندگی میں صرف ایک بار ہی فرض ہے، اسی طرح اس کی استطاعت بھی کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے، لیکن لوگوں کی ایک تعداد ہے، جو اس عظیم عبادت کی اہمیت، اس کے مناسک، افعال، طور طریقے اور آداب وغیرہ سے ناآشنا ہیں، جس وجہ سے اتنی عظیم عبادت کماحقہ بجا نہیں لاتے، اور طرح طرح کے کفارات یا صدقات اپنے اوپر لازم کر لیتے ہیں۔ اور یوں بھی دیکھا گیا ہے کہ کفارات میں دم وغیرہ لازم ہو تو کچھ یہ کہہ دیتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ معاف فرمائے گا" بے شک اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا ہے مگر حج پر دم وغیرہ کے احکامات اور دیگر مالی کفارات کا حکم بھی تو شریعت مطہرہ نے ہی دیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ حج ادا فرمایا اور صحابہ کرام علیہم الرضوان کو تاکید کے ساتھ احکامات کی تعلیم بھی دی ہے اور حج کے مناسک سکھائے ہیں، لہٰذا ہر مسلمان پر لازمی ہے کہ فریضہ حج کو اسی طریقے سے ادا کریں جیسے شریعت مطہرہ نے فرمایا ہے۔

1...(کَنْزُالْعُمّال، کتاب: حج وعمرہ، جز:5، جلد:3، صفحہ:7، حدیث:11837)

2...(معجم اَوسط، جلد:3، صفحہ:416، حدیث:4997)

3...(مشکوٰۃُالمصابیح، جزء:1، جلد:1، صفحہ:472، حدیث:2539)

مسلمانوں کی دینی رہنمائی کے لیے دار الافتاء اہلسنت (دعوتِ اسلامی) سے مختلف موضوعات پر ماہانہ سینکڑوں فتاوی جاری ہوتے ہیں۔

دار الافتاء اہلسنت کا شعبہ نشرواشاعت ان فتاویٰ میں سے حج و عمرہ سے متعلق منتخب فتاویٰ کو ایک جگہ جمع کر کے کتابی صورت میں بنام "فتاوٰی اہلسنت حج و عمرہ (حصہ اول)" پیش کر رہا ہے۔ جس میں آپ پڑھ سکیں گے:

احرام، طواف، سعی، حلق و تقصیر کے احکامات، حج و عمرہ میں ہونے والی غلطیوں کی معلومات، ان کی وجہ سے لازم آنے والے کفارے، نیز احرام کی پابندیوں کا خیال نہ رکھنا، احرام ممنوعات کا ارتکاب کرنا، بلا عذر ویل چیئر یا الیکٹرک بائیک پر طواف یا سعی کرنا، احرام کی حالت میں پیمپر یا ڈائپر لگانا، زیرو مشین سے حلق یا تقصیر ہو جاتی ہے یا نہیں؟ ان کے علاوہ اور بہت سارے مسائل کی آگہی حاصل کرنے کے یہ کتاب خود بھی پڑھیں اور دوسروں تک پہنچا کر ثواب بھی حاصل کریں۔

اللہ کریم اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل ہم سب کو اپنے مقدس گھر کی حاضری اور بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے در کی حاضری نصیب فرمائے۔

آمین بجاہ النبی الامین صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم

ابو حذیفہ محمد شفیق عطاری مدنی

دار الافتاء اہلسنت (اقصیٰ مسجد) صدر، کراچی

18 ذوالقعدۃ الحرام 1446ھ / 16 مئی 2025ء

احرام

فتوی 1:

احرام کی نیت کرتے وقت تلبیہ (لبیک یا اس کے قائم مقام الفاظ) نہیں کہے، تو محرم ہو گا یا نہیں؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ میرے دوست نے ایک مسئلہ بیان کیا کہ عمرہ میں نیت کرنے کے ساتھ ساتھ ایک دفعہ تلبیہ یعنی "لبيك اللهم لبيك الخ" کہنا ضروری ہوتا ہے، اگر کسی نے تلبیہ نہ کہا، تو اس کا عمرہ شروع ہی نہیں ہو گا۔ پوچھنا یہ ہے کہ کیا واقعی یہ بات درست ہے کہ بغیر تلبیہ کہے احرام باندھا، تو عمرہ شروع نہیں ہو گا؟ شرعی رہنمائی فرما دیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

جی ہاں! یہ بات درست ہے کہ احرام میں داخل ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ حج یا عمرہ میں سے کسی ایک منسک (یعنی عبادت) کو ادا کرنے کی نیت کرنے کے ساتھ ساتھ تلبیہ یعنی "لبيك اللهم لبيك" یا اس کے قائم مقام ذکر اللہ کرنا، ضروری ہے اور تلبیہ یا تلبیہ کے قائم مقام ذکر کرتے وقت احرام کی نیت کا ہونا بھی ضروری ہے، صرف ذکر اللہ کی نیت کرنے سے تلبیہ شمار نہیں ہو گا۔ اگر کسی شخص نے احرام کی نیت کرنے کے ساتھ تلبیہ یعنی "لبيك اللهم لبيك" یا کوئی ذکر اللہ احرام کی نیت سے نہ کیا، بلکہ ذکر اللہ کی نیت کی، تو ایسا شخص مُحرِم نہیں کہلائے گا اور نہ ہی ایسے شخص کا عمرہ ادا ہو گا، البتہ یہ یاد رکھیں کہ تلبیہ میں خاص "لبيك اللهم لبيك" کہنا سنت ہے۔

احرام کی شرائط میں سے ایک شرط تلبیہ کہنا بھی ہے، اس کے متعلق جزئیات درج ذیل ہیں۔

فتاوی ہندیہ میں احرام کی شرائط وغیرہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: "لبیک اللھم لبیک لبیک لا شریک لک الخ۔ وھی مرۃ شرط والزیادۃ سنۃ۔۔۔اما شرطہ فالنیۃ حتی لا یصیر محرما بالتلبیۃ بدون نیۃ الاحرام **ولا یصیر شارعا بمجرد النیۃ ما لم یات بالتلبیۃ او ما یقوم مقامھا من الذکر**" ترجمہ: لبیک اللھم لبیک لبیک لا شریک لک (آخر تک) ایک مرتبہ کہنا شرط اور ایک سے زیادہ مرتبہ کہنا سنت ہے۔۔۔بہر حال احرام کی شرط، تو وہ نیت ہے، یہاں تک کہ احرام کی نیت کے بغیر تلبیہ کہنے سے محرم نہ ہو گا۔ **اسی طرح صرف احرام کی نیت کرنے سے محرم نہیں ہو گا، جب تک کہ احرام کی نیت سے تلبیہ یا اس کے قائم مقام ذکر نہ کر لے۔**[1]

امام اہل سنت امام احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "رکن احرام کے صرف دو ہیں، دل سے نیت اور اس کے ساتھ زبان سے وہ ذکر جس میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہو، خواہ لبیک یا کچھ اور مثل "سبحان اللہ یا الحمد للہ یا اللہ اکبر یا اللھم اغفرلی وغیر ذلک" جب یہ دونوں باتیں پائی گئیں، احرام بندھ گیا اور جو کچھ مُحرِم پر حرام تھا، حرام ہو گیا۔ **پر لبیک کہنا سنت** اور مُحرِم کے لیے ہر ذکر سے بہتر ہے جہاں تک ہو سکے اس کی کثرت کرے۔"[2]

"لبیک کہنا سنت" اس عبارت پر فتاوی رضویہ کے حاشیہ میں ہے: "وقع فی اللباب ان التلبیۃ مرۃ فرض وفی النھر والدر انھا مرۃ شرط۔ قال القاری وھو عند الشروع لا غیر، لکن التحقیق ان الفرض والشرط انما ھو مطلق الذکر لا خصوص التلبیۃ کما حققہ فی البحر، قال: وقول من قال

1...(فتاوی ھندیہ، جلد1، صفحہ222، مطبوعہ کوئٹہ)

2...(فتاوی رضویہ، جلد10، صفحہ779، 780، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاھور)

انھا شرط، مرادہ ذکر یقصد بہ التعظیم لا خصوصھا وتمامہ فی ردالمحتار۔ اقول: وقد نص فی اللباب قبیل ما مران کل ذکر یقصد بہ تعظیم اللہ سبحانہ یقوم مقام التلبیۃ۔ وفیہ فی صدر باب الاحرام شرائط صحتہ الاسلام والنیۃ والذکر اوتقلید البدنۃ ثم عد من سننہ تعیین التلبیۃ۔ قال القاری رحمۃ اللہ علیہ ھناک التلبیۃ اوما یقوم مقامھا من فرائض الاحرام عند اصحابنا **وفی الدر یصح الحج بمطلق النیۃ ولو بقلبہ لکن بشرط مقارنتھا بذکر یقصد بہ التعظیم** فانکشف الغطاء والحمدللہ رب العلمین "یعنی لباب میں مذکور ہے کہ تلبیہ ایک مرتبہ فرض ہے اور نہر الفائق اور دُر میں ہے کہ ایک بار شرط ہے۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ صرف شروع میں ہے، **لیکن تحقیق یہ ہے کہ فرض اور شرط تلبیہ نہیں، بلکہ مطلقاً ذکر ہے**، جیسا کہ بحر میں اس کی تحقیق ہے۔ جن لوگوں نے تلبیہ کے شرط ہونے کا قول اختیار کیا، ان کی مراد یہ ہے کہ ایسا ذکر جس سے تعظیم کا قصد کیا جائے، نہ کہ خاص تلبیہ۔ مکمل بحث ردالمحتار میں ہے۔ **اقول:** لباب میں پچھلی عبارت سے تھوڑا سا پہلے تصریح ہے کہ ہر وہ ذکر جس سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تعظیم کا قصد کیا جائے وہ تلبیہ کے قائم مقام ہوتا ہے۔ اسی میں باب الاحرام کے شروع میں ہے کہ احرام کے صحیح ہونے کی شرط اسلام، نیت، ذکر یا بُدنہ کی تقلید ہے۔ پھر اس کی سنتوں میں تلبیہ کو ذکر کیا، ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ: ہمارے اصحاب کے نزدیک یہاں تلبیہ یا اس کے قائم مقام کوئی ذکر، احرام کے فرائض میں سے ہے۔ **دُر میں ہے کہ حج، مطلق نیت سے صحیح ہو جاتا ہے خواہ صرف دل سے نیت ہو، بشرطیکہ نیت کے ساتھ کوئی ایسا ذکر ہو جس سے تعظیم مقصود ہو۔** تو اس سے پردہ ہٹ گیا اور تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو عالمین کا رب ہے۔"[1]

احرام کی شرائط کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے، صدر الشریعہ، بدر الطریقہ مفتی امجد علی

---

1 ...(فتاوی رضویہ، جلد10، صفحہ779تا781، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاھور)

اعظمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "تنہا نیت بھی کافی نہیں جب تک لبیک یا اس کے قائم مقام کوئی اور چیز نہ ہو۔"[1]

تلبیہ یا تلبیہ کے قائم مقام ذکر کرنے کے وقت احرام کی نیت کا ہونا ضروری ہے، اس کے متعلق جزئیات درج ذیل ہیں:

تلبیہ کے وقت احرام کی نیت کا ہونا ضروری ہے، جیسا کہ البحر العمیق، فتاوی تاتار خانیہ، محیط برھانی میں ہے: " واللفظ للمحیط:واعلم بان الروایات قد اختلفت فی ھذا الفصل، فی روایۃ ابن سماعۃ بمجرد النیۃ لا یصیر محرماً الا ان یلبی او یکبر او یذکر اللہ، یرید بہ الاحرام "ترجمہ: تو جان کہ اس مسئلے میں روایات مختلف ہیں۔ ابن سماعہ کی روایت میں ہے کہ محض نیت سے محرم نہیں ہو گا، مگر یہ کہ نیت کے ساتھ تلبیہ، **تکبیر یا کوئی اور اللہ پاک کا ذکر کرے اور اس ذکر سے احرام کا ارادہ ہو۔**[2]

النتف فی الفتاوی میں ہے: " فاما الاحرام فھو التلبیۃ مع وجود النیۃ وھو علی ثلاثۃ اوجہ: احدھا اذا نوی ولم یلب فلیس بمحرم بالنیۃ وحدھا والثانی ان لبی ولم ینو فلیس بمحرم ایضا فی قول ابی حنیفۃ واصحابہ وھو محرم فی قول ابی عبد اللہ علی نیتہ القدیمۃ **والثالث ان لبی ونوی فھو محرم متفقا** "ترجمہ: بہر حال احرام یہ تلبیہ اور نیت کے موجود ہونے کے ساتھ تین صورتوں پر مشتمل ہے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ جب کسی شخص نے احرام کی نیت کی، لیکن تلبیہ نہیں کہا، تو وہ شخص فقط نیت سے محرم نہیں ہو گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے تلبیہ کہا، لیکن احرام کی نیت نہیں کی، تو ایسا شخص بھی امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان

1...(بہار شریعت، جلد1، حصہ6، صفحہ1074، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

2...(محیط برھانی، جلد2، صفحہ420، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

کے اصحاب علیہم الرحمۃ کے نزدیک محرم نہیں ہو گا، البتہ ابو عبد اللہ کے قول کے مطابق سابقہ نیت کے اعتبار سے محرم ہو گا۔ **تیسری صورت یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے تلبیہ کہا اور ساتھ میں احرام کی نیت بھی کی، تو ایسا شخص بالاتفاق محرم ہو گا۔**[1]

احرام کے وقت تلبیہ کہنے کی حیثیت کے متعلق جو بحث فرمائی، اس بحث کے دوران معتمد قول کو بیان کرتے ہوئے ملا علی قاری لکھتے ہیں: "فالمعتمد ما ذکرہ حسام الدین الشھید انه یصیر شارعا بالنیة لکن عند التلبیة لا بالتلبیة کما یصیر شارعا فی الصلاۃ بالنیة لکن عند التکبیر لا بالتکبیر "ترجمہ: معتمد قول وہ ہے جس کو حسام الدین شہید رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا کہ احرام شروع تو نیت سے ہو گا، مگر تلبیہ کے وقت ہو گا، فقط تلبیہ کے ساتھ محرم نہیں ہو گا، جیسا کہ نماز میں داخل تو نیت سے ہو گا مگر تکبیر کے وقت ہو گا صرف تکبیر سے نماز میں داخل نہیں ہو گا۔[2]

صدر الشریعہ، بدر الطریقہ مفتی امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "احرام کے لیے ایک مرتبہ زبان سے لبیک کہنا ضروری ہے اور اگر اس کی جگہ "سُبْحٰنَ اللهِ، یا، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ" **یا کوئی اور ذکرِ الٰہی کیا اور احرام کی نیت کی، تو احرام ہو گیا،** مگر سنت لبیک کہنا ہے۔"[3]

واللہ اعلم عزوجل **ورسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــــــــه

مفتی ابو محمد علی اصغر عطاری مدنی

14 جمادی الاولیٰ 1444ھ/09 دسمبر 2022ء

1...(النتف فی الفتاوی، صفحہ 207، مطبوعہ دار الفرقان)

2...(ارشاد الساری الی مناسک ملا علی قاری، صفحہ 125، 126، مطبوعہ مکۃ المکرمہ)

3...(بہار شریعت، جلد 1، حصہ 6، صفحہ 1074، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

فتوی 2:

کیا احرام کی چادریں تبدیل کر سکتے ہیں؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ عمرہ کے احرام کی حالت میں اگر کوئی نہانا چاہے، تو کیا غسل کے لیے احرام کی چادریں اتار سکتا ہے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملك الوهاب اللهم هداية الحق والصواب

حج یا عمرہ کی نیت سے احرام باندھنے کے بعد کسی ضرورت، مثلاً نہانے یا اِحرام تبدیل کرنے وغیرہ کے لیے اِحرام کی چادریں اُتارنا، جائز ہے، شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، نہ ہی اس سے مُحْرِم اِحرام سے باہر ہو جاتا ہے، بلکہ احرام سے باہر تب ہی ہو گا، جب عمرہ کے تمام مناسک ادا کر لینے کے بعد حلق یا تقصیر کروا لے گا، البتہ نہانے میں چند باتوں کا لحاظ ضروری ہے: احرام کے ممنوعات سے بچے، شیمپو استعمال نہ کرے، میل چھڑائے بغیر نہائے، اس طرح نہائے کہ کوئی بال نہ ٹوٹنے پائے۔

تنبیہ: عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید اِحرام کی چادر پہننے کو حالتِ احرام کہتے ہیں، اِسی لیے وہ چادر تبدیل کرنے یا اُتارنے پر بھی سوچ میں پڑتے ہیں کہ کہیں اِحرام نہ کُھل جائے، یہ غلط فہمی مسائل سے آگاہی نہ ہونے کی بنا پر ہے، احرام دراصل ایک حالت کا نام ہے، جس کا دار و مدار نیت اور تلبیہ کہنے پر ہے اور مرد کے لیے بغیر سِلا لباس پہننا یا احرام کی چادر باندھنا، ان پابندیوں میں سے ایک پابندی ہے، صرف چادر کا نام حالتِ احرام نہیں ہے، لہٰذا نہانے کے لیے اِحرام کی چادریں اتارنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔

چنانچہ اِحرام باندھنے کے بعد محرم ہونے کی حالت میں نہانا خود نبی پاک صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اور آپ کے اَصحابِ کرام عَلَیْہِمُ الرِّضْوَان کے عملِ مبارک سے ثابت ہے اور یہ بات واضح ہے کہ نہانے کے لیے لباس اُتارا جاتا ہے، لہٰذا اشارۃً ان روایات سے بھی معلوم ہوا کہ اِحرام کا لباس اتارا جا سکتا ہے۔

صحیح بخاری شریف میں ہے: حضرت عبد اللہ بن حنین رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت مسور بن مخرمہ رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُمَا کا مقامِ ابواء میں (ایک مسئلہ پر) اختلاف ہوا، حضرت عبد اللہ بن عباس رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُمَا نے فرمایا کہ محرم غسل کرتے ہوئے سر دھوئے گا اور حضرت مسور بن مخرمہ رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُ نے فرمایا کہ اپنا سر نہیں دھوئے گا، تو راوی حضرت عبد اللہ بن حنین رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُ کہتے ہیں) مجھے حضرت عبد اللہ بن عباس رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُمَا نے حضرت ابو ایوب انصاری رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُ کے پاس (مسئلہ پوچھنے کے لیے) بھیجا، میں جب ان کی خدمت میں پہنچا، **تو وہ دو لکڑیوں کے بیچ غسل کر رہے تھے اور انہوں نے ایک کپڑے سے پردہ کر رکھا تھا،** میں نے پہنچ کر سلام کیا، تو انہوں نے استفسار فرمایا کہ کون ہو؟ میں نے عرض کیا کہ میں عبد اللہ بن حنین رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُ ہوں، آپ رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُ کی خدمت میں مجھے عبد اللہ بن عباس رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُمَا نے یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا ہے کہ احرام کی حالت میں رسول اللہ صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ (غسل کرتے ہوئے) سر مبارک کس طرح دھوتے تھے، (یہ سن کر) انہوں نے کپڑے پر (جس سے پردہ کیا تھا) ہاتھ رکھ کر اسے نیچے کیا، یہاں تک کہ آپ کا سر دکھائی دینے لگا، پھر جو شخص ان کے بدن پر پانی ڈال رہا تھا، اس سے انہوں نے پانی ڈالنے کے لیے کہا، اس نے ان کے سر پر پانی ڈالا، پھر انہوں نے اپنے سر کو

دونوں ہاتھوں سے ہلایا اور دونوں ہاتھ آگے لے گئے اور پھر پیچھے لائے اور فرمایا: "ھکذا رأیتہ صلی اللہ علیہ وسلم یفعل" ترجمہ: **میں نے رسول اللہ** صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ **کو(احرام کی حالت میں)اسی طرح کرتے دیکھا تھا۔**[1]

امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ(سالِ وفات:458ھ) **نقل کرتے ہیں:** "ویروی عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم أنہ اغتسل وھو محرم" ترجمہ: مروی ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے محرم ہونے کی حالت میں غسل فرمایا۔[2]

ملک العلماء علامہ کاسانی حنفی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ(سالِ وفات:587ھ/1191ء) **لکھتے ہیں:** "ولا بأس بأن یحتجم المحرم، ویدخل الحمام ویغتسل ...وأما الاغتسال فلما روي أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اغتسل وھو محرم" ترجمہ: اور محرم کے پچھنے لگانے، حمام میں داخل ہونے اور غسل کرنے میں کوئی حرج نہیں،... بہر حال غسل کرنا اس لیے جائز ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے احرام کی حالت میں غسل فرمایا۔[3]

علامہ بُرہانُ الدین مَرغینانی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ(سالِ وفات:593ھ/1196ء) **لکھتے ہیں:** "ولا بأس بأن یغتسل ویدخل الحمام، لأن عمر رضي اللہ عنہ اغتسل وھو محرم" ترجمہ: اور محرم کے غسل کرنے اور حمام میں داخل ہونے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ حضرت سیدنا عمر فاروق اعظم رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُ نے محرم ہونے کی حالت میں غسل فرمایا۔[4]

1...(صحیح البخاری، کتاب العمرۃ، باب الاغتسال للمحرم، جلد1، صفحہ337، مطبوعہ لاھور)

2...(معرفۃ السنن والآثار، کتاب المناسک، الغسل بعد الاحرام، جلد7، صفحہ175، مطبوعہ دار قتیبہ، بیروت)

3...(بدائع الصنائع، کتاب الحج، فصل تطییب المحرم، جلد2، صفحہ191، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ)

4...(الھدایہ، کتاب الحج، باب الاحرام، جلد1، صفحہ136، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

موسوعہ فقہیہ کویتیہ میں ہے:"لا خلاف بين الفقهاء في جواز اغتسال المحرم بالماء والانغماس فيه" ترجمہ: مُحرم کے لیے پانی سے غسل کرنے اور اس میں غوطہ لگانے کے مسئلہ میں فقہائے کرام کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔[1]

حالتِ احرام میں جن اُمور کی اجازت ہے اُن کا بیان کرتے ہوئے صدر الشریعہ مفتی محمد امجد علی اعظمی رَحْمَةُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات:1367ھ/1947ء) لکھتے ہیں:"بے میل چھڑائے حمام کرنا (پانی میں نہانا)، غوطہ لگانا (جائز ہے)۔"[2]

حقیقتاً احرام خاص حالت کا نام ہے، نہ کہ احرام میں باندھی جانے والی چادریں احرام ہیں، ہاں مجازاً ان چادروں کو احرام کہا جاتا ہے، چنانچہ اِحرام کی تعریف کے متعلق قاضی ابو الحسن علی بن حسین السغدی حنفی رَحْمَةُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات:461ھ/1068ء) لکھتے ہیں:"اما الاحرام فهو التلبية مع وجود النية" ترجمہ: بہر حال احرام تو وہ (حج یا عمرہ یا دونوں کی) نیت کے ساتھ تلبیہ پڑھنے کو کہا جاتا ہے۔[3]

رفیق الحرمین میں ہے:"جب حج یا عمرہ یا دونوں کی نیت کرکے تلبیہ پڑھتے ہیں، تو بعض حلال چیزیں بھی حرام ہو جاتی ہیں ، اس لیے اس کو"احرام" کہتے ہیں۔ اور مجازاً ان بغیر سلی چادروں کو بھی احرام کہا جاتا ہے جن کو احرام کی حالت میں استعمال کیا جاتا ہے۔"[4]

اور محرم کے لیے احرام کے لباس کو تبدیل کرنا، جائز ہے، چنانچہ نبی پاک صَلَّی اللہ تَعَالٰی

1...(الموسوعة الفقهية الكويتية، جلد35، صفحہ78، مطبوعہ وزارتِ اوقاف، کویت)

2...(بہار شریعت، جلد1، حصہ6، صفحہ1080، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ، کراچی)

3...(النتف فی الفتاوی، کتاب المناسک، فرائض الحج، صفحہ133، مطبوعہ کوئٹہ)

4...(رفیق الحرمین، صفحہ58، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ، کراچی)

عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ سے احرام تبدیل کرنا ثابت ہے ، جیسا کہ السنن الکبری للبیہقی میں ہے : ”عن عکرمة مولی ابن عباس أن النبي صلی اللہ علیه وسلم غیر ثوبیه بالتنعیم وھو محرم“ ترجمہ : حضرت سیدنا عکرمہ جو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے آزاد کردہ غلام ہیں، آپ سے روایت ہے کہ نبی پاک صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے حالتِ احرام میں مقامِ تنعیم پر اپنے احرام کے دونوں کپڑوں کو تبدیل فرمایا۔[1]

اور صحیح بخاری شریف میں ہے: ”وقال إبراھیم لا بأس أن یبدل ثیابه“ ترجمہ: امام ابراہیم نخعی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرماتے ہیں کہ محرم کے احرام (پہننے کے بعد اُسے) تبدیل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔[2]

علامہ شمسُ الدین محمد عرفہ دسوقی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ ”حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر“ میں لکھتے ہیں: ”(قوله: وجاز إبدال ثوبه) أي جاز للمحرم أن یبدل ثوبه الذي أحرم فیه بغیره سواء کان الثوب إزارا أو رداء“ ترجمہ: اور محرم کے لیے یہ جائز ہے کہ جس لباس میں احرام کی نیت کی تھی، اسے تبدیل کرکے کوئی اور لباس پہن لے، خواہ نیچے کا لباس بدلے یا اوپر کی چادر کو بدلے۔[3]

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

21 ذی القعدۃ الحرام 1443ھ/21 جون 2022ء

1...(السنن الکبری للبیهقي، جلد5، صفحه82، مطبوعه دار الکتب العلمیه، بیروت)

2...(صحیح البخاری، کتاب المناسک، جلد1، صفحه293، مطبوعه لاھور)

3...(حاشیة الدسوقي علي الشرح الکبیر، جلد2، صفحه57، مطبوعه دار الفکر)

فتوی 3:

حالتِ احرام میں ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے یا نفل غسل کرنا کیسا؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ کیا احرام کی حالت میں فرض غسل کے علاوہ نفل غسل بھی کر سکتے ہیں یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

احرام کی حالت میں فرض غسل کے علاوہ نفل غسل، یا ویسے ہی گرمی دور کرنے اور ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے غسل کرنے کی شرعاً اجازت ہے۔اس کے جواز کی **اولاً** دلیل یہ ہے کہ اس کی ممانعت نہیں۔**ثانیاً:** حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما احرام کی حالت میں مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے پہلے مقامِ ذی طوی پر غسل کرتے اور فرماتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا ہی کرتے تھے۔**ثالثاً:** حاجی کے لیے چند مواقع پر غسل کرنا مسنون و مستحب ہے، جیسا کہ حاجی کے لیے میدان عرفات میں زوال کے بعد وقوف عرفہ کے لیے غسل کرنا سنتِ مؤکدہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ غسل واجب تو نہیں ہے، بلکہ نفل ہے اور یہ احرام کی حالت میں ہی ہوگا، لہٰذا احرام کی حالت میں نفل غسل بھی کر سکتے ہیں، اس میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔

احرام کی حالت میں غسل کرنا، جائز ہے، چنانچہ مبسوط سرخسی میں ہے: ”ولا بأس للمحرم أن يغتسل فإن عمر رضى الله عنه اغتسل، وهو محرم“ ترجمہ: اور مُحرِم کے لیے غسل کرنے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے محرم ہونے کی حالت میں غسل

کیا۔[1]

تبیین الحقائق میں ہے:”لا يتقي الاغتسال ودخول الحمام؛ لأنه عليه الصلاة والسلام «اغتسل، وهو محرم» رواه مسلم وحكى أبوأيوب الأنصاری اغتسال رسول الله صلى الله عليه وسلم متفق عليه وكان عمر يغتسل، وهو محرم“ترجمہ: محرم غسل کرنے اور حمام میں داخل ہونے سے نہیں بچے گا، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل کیا اس حالت میں کہ آپ مُحرم تھے، اس کو امام مسلم نے روایت کیا اور ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے (محرم ہونے کی حالت میں) غسل کرنے کو بیان کیا جو کہ متفق علیہ ہے (یعنی امام بخاری اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے اس کو روایت کیا ہے) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ غسل کرتے تھے اس حالت میں کہ آپ محرم ہوتے۔[2]

مکہ مکرمہ میں داخلے کے لیے غسل کرنے سے متعلق صحیح بخاری شریف کی حدیث پاک

میں ہے:”عن نافع، قال: كان ابن عمر رضي الله عنهما «إذا دخل أدنى الحرم أمسك عن التلبية، ثم يبيت بذی طوى، ثم يصلي به الصبح، ويغتسل»، ويحدث أن نبي الله صلى الله عليه وسلم كان يفعل ذلك“ترجمہ: حضرت نافع سے روایت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جب حرم کے قریب پہنچ جاتے، تو تلبیہ سے رک جاتے، پھر مقام ذی طوی پر رات گزارتے اور پھر صبح وہاں نماز پڑھتے اور غسل کرتے اور فرماتے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا کیا کرتے تھے۔[3]

1۔۔۔(مبسوط سرخسی، جلد4، صفحہ101، دارالمعرفہ، بیروت)

2۔۔۔(تبیین الحقائق، جلد2، باب الاحرام، صفحہ13، مطبوعہ قاھرہ)

3۔۔۔(صحیح البخاری، جلد2، صفحہ144، رقم الحدیث:1573، دارطوق النجاۃ)

مکہ مکرمہ میں داخلے کے لیے غسل کرنا، مُحرم اور غیر مُحرم سب کے لیے مستحب ہے،

چنانچہ اس حدیث کے تحت عمدۃ القاری میں ہے:"وقال ابن المنذر: الاغتسال لدخول مكة مستحب عند جميع العلماء، إلا أنه ليس في تركه عامدا عندهم فدية۔۔۔ والغسل لدخول مكة ليس لكونها محرما، وإنما هو لحرمة مكة حتى يستحب لمن كان حلالا أيضا" ترجمہ: ابن منذر نے فرمایا کہ مکہ میں داخل ہوتے وقت تمام علماء کے نزدیک غسل مستحب ہے ، مگر یہ کہ جان بوجھ کر اس کے ترک میں کوئی فدیہ لازم نہیں۔۔۔اور مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کے لیے غسل کرنا، محرم ہونے کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ یہ مکہ مکرمہ کی حرمت کے پیش نظر ہے، یہاں تک کہ یہ غیر محرم کے لیے بھی مستحب ہے۔[1]

"شرح النووی للمسلم"میں ہے:"واتفق العلماء على جواز غسل المحرم رأسه وجسده من الجنابة بل هو واجب عليه وأما غسله تبردا فمذهبنا ومذهب الجمهور جوازه بلا كراهة" ترجمہ: اور علماء کا محرم کے جنابت سے اپنے سر اور جسم کو دھونے پر اتفاق ہے، بلکہ اس پر (غیر حاجی کی طرح جنابت سے غسل) واجب ہے، اور بہر حال ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے غسل کرنا، تو ہمارا اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ یہ بلا کراہت جائز ہے۔[2]

حاجیوں کے وقوف عرفہ کے لیے غسل کرنے کے متعلق تنویر الابصار مع در مختار میں

ہے:"وسن۔۔۔(لاجل احرام و) في جبل (عرفة) بعد الزوال" ترجمہ: اور احرام کے لیے اور میدان عرفات میں زوال کے بعد غسل سنت ہے۔[3]

1...(عمدۃالقاری، جلد9، صفحہ207، 208، دارإحياء التراث العربي، بيروت)

2...(شرح النووی للمسلم، جلد8، صفحہ126، دارإحياء التراث العربي، بيروت)

3...(تنویرالابصار مع درمختار، جلد1، صفحہ340، 341، دارالمعرفہ، بیروت)

صدر الشریعہ مفتی امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ بہار شریعت میں ارشاد فرماتے ہیں: ”جب دوپہر قریب آئے نہاؤ کہ سنتِ مؤکدہ ہے اور نہ ہو سکے تو صرف وضو (کر لو)۔“ [1]

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبــــــــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

13 جمادی الاولی 1446ھ/09 نومبر 2024ء

فتوی 4:

پیشاب کے قطروں کا مرض ہو تو محرم احرام کو نجاست سے کیسے بچائے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ مجھے پیشاب کے قطروں کا مرض ہے، اگرچہ میں شرعی معذور نہیں ہوں، مگر کب قطرہ آ جائے مجھے اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اللہ پاک کے کرم سے میں حج پر جا رہا ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ قطروں سے میرا بدن اور احرام ناپاک نہ ہو، تو کیا میں احرام کی حالت میں عضو مخصوص پر کوئی بغیر سلا ہوا کپڑا یا پیپر وغیرہ لپیٹ سکتا ہوں؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق والصواب

پوچھی گئی صورت میں آپ کا یہ عمل سر اور چہرے کے علاوہ بدن کے کسی حصے پر پٹی باندھنے کی طرح ہے اور سر اور چہرے کے علاوہ بدن کے کسی حصے پر پٹی باندھنا اگر کسی عذر کی وجہ سے ہو، تو جائز ہوتا ہے اور بغیر عذر ہو، تو مکروہ ہوتا ہے، البتہ کفارہ کسی صورت میں بھی نہیں ہوتا۔ پوچھی گئی صورت میں بدن اور احرام کے لباس کو نجاست سے بچانا بھی ایک عذر ہے کہ

---

1 ...(بہار شریعت، جلد 1، حصہ 6، صفحہ 1123، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

شریعت میں نجاست سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے، لہذا یہ عمل مکروہ بھی نہیں کہلائے گا۔ نیز عذر نہ ہونے کی صورت میں جو کراہت ہے، اس کی وجہ فقہاء نے یہ لکھی ہے کہ یہ ایک عبث اور لغو کام ہے، اس لیے مکروہ ہے، اور ظاہر ہے کہ بدن اور احرام کو نجاست سے بچانا کوئی عبث اور فضول کام نہیں ہے۔ لہذا اس میں کراہت بھی نہیں ہو گی۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں محرم کے بارے میں ہے: "(و) لا يتقي (ختانا وفصدا)"

ترجمہ: یہ ضروری نہیں ہے کہ محرم ختنہ کرنے اور فصد لگانے سے بچے۔[1]

ردالمحتار میں اس کے تحت فرمایا: "أي وان لزم تعصيب اليد لما قدمناه من أن تعصيب غير الوجه والرأس انما يكره لو بغير عذر" ترجمہ: یعنی اگرچہ ان صورتوں میں پٹی باندھنا لازم آئے گا (پھر بھی فصد وختنہ درست ہے) کیونکہ ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں کہ چہرے اور سر کے علاوہ پٹی باندھنا تب مکروہ ہے جبکہ عذر کے بغیر ہو۔[2]

فتح القدیر میں کراہت کی علت بیان کرتے ہوئے فرمایا: "ما قدمناه من كراهة عصب غير الرأس من بدنه انما هو لكونه نوع عبث" ترجمہ: ہم نے جو پیچھے بیان کیا کہ سر کے علاوہ بدن کے کسی حصے پر پٹی باندھنا مکروہ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک عبث کام ہے۔[3]

و اللہ اعلم عزوجل و رسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبــــــــــــــــــــــہ	الجواب صحیح
المتخصص فی الفقہ الاسلامی ابو محمد محمد فراز عطاری مدنی 05 ذو القعدۃ الحرام 1444ھ/26 مئی 2023ء	مفتی ابو محمد علی اصغر عطاری مدنی

---

1 ...۔ (تنویر الابصار مع الدر المختار، جلد 3، صفحہ 573، مطبوعہ کوئٹہ)

2 ...۔ (ردالمحتار مع الدر المختار، جلد 3، صفحہ 573، مطبوعہ کوئٹہ)

3 ...۔ (فتح القدیر، جلد 2، صفحہ 445، مطبوعہ بیروت)

فتوی 5:

سر کے بال پورے سے کم ہوں تو زیرو مشین پھیرنے سے احرام سے باہر ہو جائے گا؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کے بال ایک پورے سے کم ہوں اور وہ حلق کے بجائے بالوں پر زیرو مشین پھیر لے، تو کیا اس صورت میں زیرو مشین پھیرنا، حلق کے قائم مقام ہو جائے گا اور مُحرِم احرام سے باہر ہو جائے گا یا نہیں؟ نیز اگر کوئی مُحرِم زیرو مشین پھیر چکا ہو، مگر اس کے بعد اُس نے سر پر اُسترہ بھی پھیر لیا ہو، تو اب کیا حکم ہو گا؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

جب مُحرِم کے بال ایک پورے سے کم ہوں، تو اِحرام سے نکلنے کے لیے اُسے حَلق کروانا ہی ضروری ہو گا، ایسی صورت میں مشین پھیرنا، کافی نہیں ہو گا، چاہے وہ مشین زیرو نمبر کی ہی کیوں نہ ہو، احرام سے نکلنے میں وہ حلق کے قائم مقام نہیں ہو گی، کیونکہ حلق میں مکمل طور پر بالوں کو زائل کرنا پایا جاتا ہے، جس کے بعد بال جِلد کی سطح سے بالکل کٹ جاتے ہیں، جبکہ زیرو مشین میں بال جِلد کی سطح سے نہیں کٹ پاتے، بلکہ جِلد کی سطح سے کچھ اونچے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زیرو مشین کے استعمال کے بعد مُشاہدے میں آتا ہے کہ بال معمولی مقدار میں باقی رہ جاتے ہیں، اگر زیرو کی مشین استعمال کرنے کے بعد سر پر اُسترہ پھیر لیا جائے، تو مزید معمولی مقدار میں بال کٹنے میں آجاتے ہیں، جس سے واضح ہوتا ہے کہ زیرو مشین اور حلق کا حکم ایک سا نہیں، لہذا اگر مُحرم کے بال ایک پورے سے کم ہوں، تو اُسے زیرو مشین پھیرنا کفایت نہیں کرے

گا اور اس سے وہ احرام سے باہر نہیں ہو گا۔ نیز اگر کوئی مُحرم زیرو مشین استعمال کر چکا ہو، مگر اس کے بعد اس نے کم از کم چوتھائی سر پر اُسترہ بھی پھیر لیا ہو، تو حلق درست ہو جائے گا اور وہ احرام سے باہر ہو جائے گا۔

حلق سے مراد کم از کم چوتھائی سر کے بالوں کو زائل کرنا ہے اور تقصیر سے مراد چوتھائی سر کے بالوں کا ایک پورے کے برابر کاٹنا ہے، چنانچہ بحر الرائق میں ہے: "والمراد بالحلق إزالة شعر ربع الرأس۔۔۔والمراد بالتقصير أن يأخذ الرجل أو المرأة من رءوس شعر ربع الرأس مقدار الأنملة" ترجمہ: حلق سے مراد چوتھائی سر کے بالوں کو زائل کرنا ہے۔ اور تقصیر سے مراد یہ ہے کہ آدمی یا عورت (کم از کم) چوتھائی سر کے بالوں کو ایک پورے کے برابر کاٹ لیں۔[1]

جب بال ایک پورے سے کم ہوں، جس کی وجہ سے تقصیر ممکن نہ رہے، تو اب حلق ہی کروانا ہو گا، چنانچہ لباب المناسک اور اس کی شرح میں ہے: "(ولو تعذر التقصير) أی تعذر لكون الشعر قصيرا (تعين الحلق)" ترجمہ: اور اگر تقصیر ممکن نہ رہے یعنی بالوں کے چھوٹا ہونے کی وجہ سے تقصیر نہ ہو سکتی ہو تو اب حلق متعین ہو جائے گا۔[2]

واجباتِ حج کی نہایت آسان اور منفرد کتاب بنام "27 واجبات حج" میں ہے: "عرفِ عام میں حَلْق کے معنی ہیں گنجا ہونا جو کہ عام طور پر اُسترے کے ذریعے ہوا جاتا ہے۔ اگر کسی نے اُسترہ استعمال کیے بغیر ہی حلق کی طرح بال مکمل صاف کر لیے، مثلاً: کوئی پاؤڈر استعمال کیا یا اُسترے کے بجائے پتھر کے ذریعے بال صاف کیے یا نوچ نوچ کر بال صاف کیے، تو بھی حلق کرنا پایا جائے گا،

1۔۔۔(بحرالرائق، جلد2، باب الاحرام، صفحہ372، دارالكتاب الإسلامي، بيروت)

2۔۔۔(لباب المناسک مع شرحہ، فصل فی الحلق والتقصير، صفحہ324، مطبوعہ مکۃ المکرمہ)

البتہ عام مشین کے ذریعے بال دور کرنا حلق نہیں کہلائے گا، کیونکہ حلق کی جو تعریف بیان کی گئی ہے، وہ اس طرح کی مشین سے بال صاف کرنے پر صادق نہیں آتی، البتہ ایسی مشین استعمال کی جو بال اُکھیڑتی ہو، تو جُدا گانہ بات ہے اور بال نوچنے کا حکم بیان ہو چکا ہے۔"[1]

واللہ اعلم عزوجل **ورسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

12 جمادی الاخری 1445ھ/26 دسمبر 2023ء

فتوی 6:

احرام کی حالت میں احتلام ہو جائے، تو کیا حکم ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص احرام کی حالت میں تھا، وہ ہوٹل میں سامان رکھنے گیا، تو تھکن کی وجہ سے احرام کی حالت میں ہی سو گیا اور اُس کو احتلام ہو گیا، تو کیا احتلام کی وجہ سے اس پر دَم لازم ہو گا یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

احرام کی حالت میں احتلام ہونے سے کچھ بھی لازم نہیں ہوتا، لہٰذا اگر احرام کی حالت میں احتلام ہو جائے، تو فرض غسل کرلے اور احرام کی چادر کا جو حصہ ناپاک ہوا ہو، اُسے پاک کرلے، یا دوسری چادر پہن لے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:"الاحتلام لا یوجب شیئا سوی الغسل"ترجمہ: (احرام کی حالت میں) احتلام سے غسل کے علاوہ کچھ بھی لازم نہیں ہوتا۔[1]

1...(27 واجبات حج اور تفصیلی احکام، صفحہ 94، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

بہار شریعت میں صدر الشریعہ بدر الطریقہ مفتی محمد امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "(احرام کی حالت میں) احتلام سے کچھ نہیں۔"[2]

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

22 ربیع الثانی 1446ھ/26 اکتوبر 2024ء

1...(الفتاوی الھندیہ، جلد 1، باب الجنایات فی الحج، صفحہ 244، دار الکتب العلمیہ، بیروت)

2...(بہار شریعت، جلد 1، حصہ 6، صفحہ 1173، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

طواف

فتوی 7:

مکروہ وقت میں طواف کرنا اور طواف کے نفل پڑھنا کیسا؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس بارے میں کہ کئی لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ جب طوافِ عمرہ یا نفلی طواف کے لیے مطاف شریف میں جاتے ہیں، تو اس وقت زوال کا مکروہ وقت چل رہا ہوتا ہے، تو وہ اسی وقت لا علمی میں طواف بھی کر لیتے ہیں اور بعد کے دو نفل بھی پڑھ لیتے ہیں، اس طرح مکروہ اوقات میں طواف کر لینا اور بعد کے نوافل پڑھنا کیسا؟ اگر کسی نے پڑھ لیے تو کیا حکم ہے؟ یہ بھی بتادیں کہ اگر کسی نے فجر و عصر کے وقت میں طواف کیا، تو کیا ان اوقات میں یہ نماز پڑھ سکتا ہے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق والصواب

تین مکروہ اوقات (یعنی سورج طلوع ہونے سے لے کر تقریباً 20 منٹ بعد تک، سورج غروب ہونے کے وقت سے تقریباً 20 منٹ پہلے اور ضحوۂ کبریٰ یعنی نصف النہار شرعی سے لے کر سورج ڈھلنے تک، جسے عوام زوال کا وقت کہتی ہے) میں طواف کرنا، تو بالکل جائز ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، جبکہ ان اوقات میں اس کے بعد والی دو رکعت نماز ادا کرنا، جائز نہیں ہے، بلکہ ان اوقات میں یہ نماز ادا ہی نہیں ہوگی، یہاں تک کہ اگر کسی نے ان اوقات میں یہ نماز پڑھی، تو وہ گنہگار ہوگا اور ساتھ ہی واجب ذمہ پر باقی رہے گا، لہٰذا اس پر لازم ہوگا کہ وہ کسی مباح وقت میں اس نماز کو دوبارہ ادا کرے، جبکہ نمازِ فجر کے پورے وقت میں اور نمازِ عصر کے فرض پڑھ لینے کے

بعد (اگرچہ ابھی مکروہ وقت شروع نہ ہوا ہو) یہ نماز ادا کرنا مکروہ تحریمی، ناجائز و گناہ ہے، لہٰذا اگر کسی نے شروع کر دی، تو اس پر لازم ہو گا کہ نماز کو توڑ کر دوبارہ مباح وقت میں ادا کرے۔

تین مکروہ اوقات میں ممانعتِ نماز کے متعلق سنن ترمذی شریف میں ہے: ”عن عقبة بن عامر الجهني قال: ثلاث ساعات كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ينهانا أن نصلي فيهن: حين تطلع الشمس بازغة حتى ترتفع، وحين يقوم قائم الظهيرة حتى تميل، وحين تضيف الشمس للغروب حتى تغرب“ ترجمہ: حضرت عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ تین اوقات ایسے ہیں جن میں نماز پڑھنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں منع فرمایا: جب سورج طلوع ہو کر روشن ہو، یہاں تک کہ بلند ہو جائے اور جب نصف النہار کا وقت ہو یہاں تک کہ سورج ڈھل جائے اور جب سورج غروب کے قریب ہو یہاں تک کہ مکمل غروب ہو جائے۔[1]

فجر کے وقت میں اور عصر کے بعد نمازِ نفل کی ممانعت کے متعلق صحیح بخاری شریف میں ہے: ”عن ابن عباس، قال: شهد عندي رجال مرضيون وأرضاهم عندي عمر، نهى رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم عن الصلوة بعد الصبح حتى تشرق الشمس وبعد العصر حتى تغرب“ ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ میرے پاس پسندیدہ لوگوں نے شہادت دی جن میں سب سے زیادہ پسندیدہ ہستی حضرت عمر ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے طلوعِ صبح کے بعد طلوعِ آفتاب تک اور عصر کے بعد غروبِ آفتاب تک (نفل) نماز سے منع فرمایا ہے۔[2]

1...(سنن الترمذی، ج02، ص340، دار الغرب الإسلامی، بیروت)

2...(صحیح البخاری، ج01، ص120، دار طوق النجاۃ)

ان اوقات میں نمازِ طواف منع جبکہ طواف جائز ہے، چنانچہ بحر الرائق میں ہے:

"وأطلق الطواف فأفاد أنه لا يكره في الأوقات التي تكره الصلاة فيها؛ لأن الطواف ليس بصلاة حقيقة" ترجمہ: اور مصنف علیہ الرحمۃ نے طواف کو مطلق ذکر کیا جس میں یہ افادہ کیا ہے کہ جن اوقات میں نماز مکروہ ہے، ان میں طواف مکروہ نہیں ہے، کیونکہ طواف حقیقی اعتبار سے نماز نہیں۔[1]

در مختار ورد المحتار میں ہے: "(ثم صلى شفعا) أي ركعتين (في وقت مباح) قيد للصلاة فقط فتكره في وقت الكراهة بخلاف الطواف، والسنة الموالاة بينهما وبين الطواف، فيكره تأخيرها عنه إلا في وقت مكروه ولو طاف بعد العصر يصلي المغرب، ثم ركعتي الطواف، ثم سنة المغرب۔۔ مر في أوقات الصلاة من أن الواجب، ولو لغيره كركعتي الطواف والنذر لا تنعقد في ثلاثة من الأوقات المنهية أعني الطلوع والاستواء والغروب، بخلاف ما بعد الفجر، وصلاة العصر فإنها تنعقد مع الكراهة فيهما" ترجمہ: پھر بعدِ طواف مباح وقت میں دو رکعت نماز پڑھے، مباح وقت کی قید صرف نماز کے متعلق ہے کہ نماز تو وقتِ کراہت میں مکروہ ہے نہ کہ طواف اور ان دو رکعتوں اور طواف کے درمیان موالات یعنی بعدِ طواف اس نماز کو فوراً ادا کرنا سنت ہے، لہٰذا طواف کے بعد اس نماز میں تاخیر کرنا مکروہ ہے، مگر یہ کہ مکروہ وقت ہو تو تاخیر مکروہ نہیں اور اگر کسی نے عصر کے بعد طواف کیا، تو وہ پہلے نماز مغرب پڑھ لے، پھر طواف کی یہ دو رکعتیں پڑھے، پھر مغرب کی سنتیں پڑھے۔۔ باب اوقات الصلوٰۃ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ واجب لغیرہ جیسے طواف کی دو رکعتیں اور منت کی نماز بھی ان تین ممنوع اوقات یعنی طلوع و

1۔۔۔ (البحر الرائق شرح کنز الدقائق، ج2، ص354، دار الکتاب الاسلامی)

غروب و استواء کے وقت منعقد نہیں ہوتی بر خلاف طلوعِ فجر اور نماز عصر کے بعد کہ ان اوقات میں یہ نماز کراہت کے ساتھ منعقد ہو جاتی ہے۔[1]

مبسوط امام سرخسی میں ہے: "وإذا طاف قبل طلوع الشمس لم يصل حتى تطلع الشمس، وقد بينا في كتاب الصلاة أن ركعتي الطواف واجب بسبب من جهته كالمنذور، وذلك لا يؤدى عندنا بعد طلوع الفجر قبل طلوع الشمس، ولا بعد العصر قبل غروب الشمس. وقد روى أن عمر رضي الله عنه طاف قبل طلوع الشمس ثم خرج من مكة حتى إذا كان بذي طوى، وارتفعت الشمس صلى ركعتين ثم قال: ركعتان مكان ركعتين" ترجمہ: اور جب کوئی سورج طلوع ہونے سے پہلے طواف کرے، تو سورج خوب طلوع ہونے تک نماز نہ پڑھے اور ہم نے کتاب الصلوٰۃ میں یہ بیان کر دیا ہے کہ طواف کی دو رکعتیں خود بندے کی جہت سے واجب ہیں، جیسے نذر کی نماز اور ایسی نماز طلوع صبح صادق کے بعد سورج طلوع ہونے سے پہلے نہیں ادا کی جاسکتی اور نہ ہی عصر کے بعد غروب شمس سے پہلے پڑھی جاسکتی ہے اور بلا شبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے سورج طلوع ہونے سے پہلے طواف کیا، پھر مکہ سے چلے یہاں تک کہ جب مقامِ ذی طویٰ میں پہنچے تو وہاں سورج بلند ہونے کے بعد دو رکعتیں پڑھیں، پھر فرمایا کہ یہ دو رکعتیں اُن دو رکعتوں کی جگہ ہیں۔[2]

واجباتِ حج کی نہایت آسان، منفرد اور مستند کتاب بنام "27 واجبات حج" میں طواف کی دو رکعتوں کے متعلق مفتی علی اصغر صاحب زید مجدہ لکھتے ہیں: "تین اوقات مکروہہ یعنی طلوع آفتاب سے تقریباً 20 منٹ بعد تک، استواء شمس سے سورج ڈھلنے تک جسے عرفِ عام میں زوال کا

1...(ردالمحتار على الدر المختار، ملتقطا، ج02، ص499، دار الفكر)

2...(المبسوط للامام السرخسی، ج04، ص47، دار المعرفة، بيروت)

وقت کہتے ہیں اور غروب آفتاب سے پہلے کے تقریباً 20 منٹ میں یہ نماز پڑھنے سے ادا ہی نہیں ہوتی یعنی یہ نماز مکروہ وقت میں پڑھنے کے سبب ذمے سے ساقط نہیں ہو گی، بلکہ اسے مباح وقت میں پڑھنا بدستور واجب رہتا ہے۔۔ اوپر ان اوقات کا بیان ہوا کہ جن میں کوئی نماز نہیں ہو سکتی ماسوائے آج کی عصر کے۔ طواف کی نماز چونکہ واجب لغیرہ ہے، اس لیے چند امور میں یہ نفل جیسے احکام رکھتی ہے، لہٰذا وقتِ فجر سے طلوع آفتاب تک اور نمازِ عصر کے بعد سے لے کر غروبِ آفتاب سے تقریباً 20 منٹ پہلے تک ان دو رکعتوں کا پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، یعنی اگر پڑھنا شروع کر دی، تو یہ نماز توڑ کر کسی مباح وقت میں پڑھنا واجب ہے۔"[1]

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

22 جمادی الاولیٰ 1446ھ/25 نومبر 2024ء

فتوی 8:

عمرے کے طواف کے پہلے دو چکر میں اضطباع نہیں کیا، تو کیا حکم ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس بارے میں کہ عمرے کے طواف کے پہلے دو چکروں میں اضطباع کرنا یاد نہ رہا، پھر تیسرے چکر میں یاد آیا، تو اب دورانِ طواف اضطباع کیا جائے گا یا نہیں؟ یا دم دینا لازم ہو گا؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق والصواب

اگر کوئی طوافِ عمرہ کے شروع کے پھیروں میں اضطباع کرنا بھول جائے، تو طواف کا

1...(27 واجباتِ حج اور تفصیلی احکام، ص 169، 170، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

ساتواں پھیرا مکمل ہونے سے پہلے پہلے جب بھی یاد آئے، دورانِ طواف ہی اضطباع کرلے، کیونکہ طوافِ عمرہ کے ساتوں پھیروں میں اضطباع سنت ہے، یہی اس کا محل مسنون ہے، جبکہ اس سے کم میں اضطباع کرنا خلافِ سنت و مکروہ ہے، لہٰذا بعض پھیروں میں اضطباع چھوٹ جانے کی وجہ سے بقیہ پھیروں میں بھی چھوڑنے کا حکم نہیں دیا جائے گا۔ نیز اس صورت میں کسی قسم کا کوئی کفارہ (دم، صدقہ) لازم نہیں۔

شرح اللباب میں ہے: ”سنن الطواف الاضطباع ای في جميع اشواط الطواف الذی سن فيه كما صرح به ابن الضياء“ ترجمہ: طواف کی سنتوں میں سے ایک سنت اضطباع ہے یعنی جس طواف میں اضطباع سنت ہے تو اس کے تمام پھیروں میں سنت ہے۔ جیسا کہ اس کی صراحت ابن ضیاءعلیہ الرحمۃ نے کی ہے۔[1]

رد المحتار میں ہے: ”إن محله المسنون قبيل الطواف إلى انتهائه لا غير“ ترجمہ: اضطباع کا محل مسنون طواف سے کچھ پہلے سے آخرِ طواف تک ہے، اس کے علاوہ نہیں۔[2]

بہار شریعت میں ہے: ”طواف کے ساتوں پھیروں میں اِضطباع سنت ہے اور طواف کے بعد اِضطباع نہ کرے۔“[3]

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبــــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

16محرم الحرام 1446ھ/23جولائی 2024ء

1...(شرح اللباب، فصل فی سنن الطواف، صفحہ176، دارالکتب العلمیہ)

2...(ردالمحتارعلی الدرالمختار، ج02، ص481، دارالفکر)

3...(بہارشریعت، جلد1، حصہ6، صفحہ1101، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ)

فتوی 9:

الیکٹرک بائیک یا ویل چیئر پر بیٹھ کر طواف کرنے کا شرعی حکم نیز دم یا صدقہ کا حکم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین اِس مسئلے کے بارے میں کہ فی زمانہ مسجد الحرام میں طواف اور سعی کے لیے کسی فرد کی مدد سے چلنے والی سادہ ویل چیئرز بھی ہوتی ہیں اور الیکٹرک ویل چیئرز (Electric Wheel Chairs)، الیکٹرک کاریں (Electric Cars)، الیکٹرک اسکوٹرز (Electric Scooters) موجود ہوتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عذر و مجبوری کے بغیر صرف سُہولت و آسانی کے لیے یا تھکاوٹ سے بچنے کے لیے حج یا عمرے کا طواف، یونہی نفل طواف پیدل چل کر نہ کرے، بلکہ ان گاڑیوں وغیرہ پر بیٹھ کر کرے، تو اس کا ایسا کرنا کیسا ہے؟ اور اس پر کوئی دم یا صدقہ لازم آئے گا یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

پوچھی گئی صورت میں کسی صحیح عذر کے بغیر صرف سُہولت و آسانی کے لیے یا تھکاوٹ سے بچنے کے لیے حج یا عمرے کا طواف، یونہی نفل طواف سادہ و الیکٹرک ویل چیئر (Electric Wheel Chair)، الیکٹرک کار (Electric Car) یا الیکٹرک اسکوٹر (Electric Scooter) وغیرہ پر کرنا، جائز نہیں ہے، کیونکہ جسے کوئی عذر نہ ہو، اس کے لیے طواف اپنے پاؤں سے پیدل چل کر کرنا واجب ہے۔ عذر سے مراد ایسی کمزوری یا بڑھاپا یا درد یا بیماری ہونا ہے کہ جس کی وجہ سے چلنے کی طاقت نہ رہے اور جب کوئی ایسی مجبوری نہ ہو، تو چاہے حج یا عمرے کا طواف ہو یا نفل طواف ہو، بہر صورت اسے پیدل ادا کرنا ہی واجب ہوتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص

صحیح عذر و مجبوری کے بغیر بیٹھ کر طواف کر لے، تو بعض صورتوں میں دَم اور بعض صورتوں میں صدقہ لازم ہوتا ہے، جس کی تفصیل نیچے آرہی ہے۔

پیدل طواف واجب ہونے کے متعلق ابو البقاء علامہ احمد مکی حنفی رحمۃ اللہ علیہ (سالِ وفات:854ھ/1450ء) فرماتے ہیں: "مِن واجبات الطواف المشی فیہ عند القدرۃ علیہ" ترجمہ: طواف کے واجبات میں سے ایک واجب قدرت ہونے کی صورت میں پیدل طواف کرنا ہے۔[1]

عذر نہ ہو، تو سواری پر طواف ناجائز ہے۔ چنانچہ لباب المناسک اور اس کی شرح مسلک المتقسط کی " فصل فی واجبات الطواف" میں ہے: "(واجبات الطواف ۔۔۔ الرابع: المشی فیہ للقادر) ففی الفتح المشی واجب عندنا وعلی ھذا نصّ المشائخ وھو کلام محمد و۔۔۔ ینبغی فی النافلۃ أن یجب لأنہ إذا شرع فیہ وجب، فوجب المشی ۔۔۔ (محرماتہ: الطواف ۔۔۔ راکباً ۔۔۔ بلا عذر ۔۔۔ ولو نفلا)، ملخصا" ترجمہ: طواف کے واجبات میں سے چوتھا واجب طاقت رکھنے والے کے لیے پیدل چلنا ہے۔ فتح القدیر میں ہے کہ ہمارے نزدیک پیدل چلنا واجب ہے اور اسی کی مشائخِ کرام نے تصریح فرمائی ہے اور یہی امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا کلام ہے اور نفلی طواف میں بھی پیدل چلنا واجب ہونا چاہئے؛ کیونکہ جب نفلی طواف شروع کر دیا، تو (اسے پورا کرنا) واجب ہو گیا، لہٰذا پیدل چلنا واجب ہو گیا۔ طواف کے حرام کاموں میں سے کسی مجبوری کے بغیر سوار ہو کر طواف کرنا ہے، اگرچہ نفل طواف ہو۔[2]

1۔۔۔(البحر العمیق، فصل الکلام فی السعی، جلد2، صفحہ1143، مطبوعہ مؤسسۃ الریّان، بیروت)

2۔۔۔(المسلک المتقسط علی لباب المناسک، صفحہ182، 168، 167، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

سیدی اعلیٰ حضرت الشاہ امام احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ (سالِ وفات: 1340ھ / 1921ء) فرماتے ہیں: ”طواف اگرچہ نفل ہو، اُس میں یہ باتیں حرام ہیں: ۔۔۔بے مجبوری سُواری پر یا کسی کی گود میں یا کندھوں پر طواف کرنا۔“[1]

عذر و مجبوری میں کون کون سی چیزیں شامل ہیں، اس کے متعلق لباب المناسک اور اس کی شرح مسلک المتقسط میں ہے: ”(بعذر کمرض) ومنہ الاغماء والجنون (او کِبر) ای بحیث یضعف عن المشی فیہ “ترجمہ: عذر کی وجہ سے جیسا کہ بیماری اور بے ہوشی اور جنون (دیوانگی / پاگل پن) بھی اسی (یعنی بیماری) میں شامل ہیں اور ایسا بڑھاپا، جس کی وجہ سے چلنے کی طاقت نہ رہے۔[2]

اگر کوئی بلا عذر بیٹھ کر طواف کرلے، تو حکم شرعی کیا ہے؟

اگر عذرِ شرعی کے سبب سوار ہو کر طواف کیا جائے، تو شرعاً کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ ہماری شریعت اِس کی اجازت دیتی ہے، لیکن اگر بلا عذر سوار ہو کر طواف کیا، تو دو صورتیں ہیں:

(1) جب تک مکہ مکرمہ میں ہے، اُس دوران سوار ہو کر کیے گئے طواف کا اعادہ یعنی اسے پیدل چل کر دوبارہ ادا کرنا لازم ہے۔

(2) اگر اعادہ کیے بغیر وطن واپس آجائیں، تو سوار ہو کر کیے گئے فرض وواجب طواف کے بدلے میں دَم، جبکہ نفل طواف میں ہر چکر کے بدلے میں ایک ایک صدقۂ فطر یعنی سات چکروں کے بدلے میں سات صدقۂ فطر لازم ہوں گے۔ یونہی اگر ایک سے زیادہ بار کے طواف

1...(فتاویٰ رضویہ، جلد 10، صفحہ 744، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاھور)

2...(المسلک المتقسط علی لباب المناسک، صفحہ 385، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

میں یہ غلطی کی، تو ہر بار کے بدلے میں الگ الگ دم یا صدقے لازم ہوں گے۔ البتہ اگر کفارہ یعنی دَم اور صدقے دینے کی بجائے اُسی سال یا بعد میں دوبارہ مکہ شریف حاضر ہو کر ایسے طواف، اعادے یعنی لَوٹانے کی نیت سے پیدل چل کر دوبارہ کر لیے جائیں، تو پہلے لازم ہونے والا کفارہ یعنی دم اور صدقے معاف ہو جاتے ہیں، اگرچہ بہتر یہ ہے کہ واپس جا کر اعادہ کرنے کی بجائے لازم ہونے والا کفارہ ہی ادا کر دیا جائے۔

فرض یا واجب طواف سواری پر کیا، تو اس کے حکم کے متعلق شمس الائمہ، امام سَرَخْسی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات:483ھ/1090ء) لکھتے ہیں: ”إن طاف راكبا أو محمولا فإن كان لعذر من مرض أو كبر لم يلزمه شيء، وإن كان لغير عذر أعاده ما دام بمكة فإن رجع إلى أهله فعليه الدم عندنا“ ترجمہ: اگر کسی نے عذرِ شرعی مثلاً: مرض یا بڑھاپے کے سبب سواری یا کسی کے کندھوں پر بیٹھ کر طواف کیا، تو اُس پر کچھ لازم نہیں، لیکن اگر بلا عذر ایسا کیا، تو جب تک مکہ میں ہے، اُس طواف کا اعادہ کرے اور اگر اپنے وطن لوٹ آیا، تو ہمارے نزدیک اُس پر دم کی ادائیگی لازم ہے۔[1]

فتاویٰ عالمگیری میں اِس مسئلہ کو طواف اور سعی کی مشترکہ صورت بنا کر یوں بیان کیا گیا: ”لو طاف راكبا أو محمولا أو سعى بين الصفا والمروة راكبا أو محمولا إن كان ذلك من عذر يجوز ولا يلزمه شيء، وإن كان من غير عذر فما دام بمكة فإنه يعيد، وإذا رجع إلى أهله فإنه يريق لذلك دما عندنا كذا في المحيط“ ترجمہ: اگر کسی نے طواف یا صفا مروہ کی سَعْی، سوار ہو کر یا کسی کے کندھوں یا ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے کی، (تو اِس کی دو صورتیں ہیں، پہلی یہ کہ) اگر ایسا کرنا

1...(المبسوط، جلد4، صفحہ45، مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت، لبنان)

کسی عذر کے سبب تھا، تو جائز ہے اور مُحرِم پر کچھ واجب نہیں، (اور دوسری صورت یہ ہے کہ) اگر بلاعذر ایسا کیا، تو جب تک وہ مکہ میں ہے، سَعْی یا طواف دوبارہ کرے اور اگر اپنے گھر واپس آ گیا، تو ہم احناف کے نزدیک حکم یہ ہے کہ دَم ادا کرے۔[1]

نفل طواف سواری پر کیا، تو کفارے میں صدقہ لازم ہونے کے متعلق علامہ ابو منصور محمد بن مکرم کرمانی حنفی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات: 597ھ / 1200ء) فرماتے ہیں: ”من طاف تطوعاً على شيء من هذه الوجوه فاحبّ إلى أن يعيد إن كان بمكة لإمكان الجبر بجنسه، وإن كان رجع إلى أهله فعليه صدقة جبراً لما دخل فيه من النقصان“ ترجمہ: جس نے نفلی طواف ان وجوہات میں سے کسی وجہ کے مطابق (یعنی واجبات میں سے کسی واجب کو ترک کرتے ہوئے) کیا، تو میرے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ اگر وہ مکہ میں ہے، تو (اس طواف کا) اعادہ کر لے، کیونکہ نقصان کو اُس کی جنس کے ساتھ پورا کرنا ممکن ہے اور اگر وہ اپنے وطن واپس جا چکا ہو، تو اُس (طواف) میں داخل ہونے والے نقصان کو پورا کرنے کے لیے اُس پر صدقہ لازم ہو گا۔[2]

فتاوی حج و عمرہ میں ہے: ”اعادہ واجب ہونے کی صورت میں اعادہ ہی ضروری ہو گا، ہاں اگر کسی وجہ سے اعادہ نہ کر سکا اور چلا گیا، تو فرض اور واجب طواف میں دَم اور نفلی طواف میں صدقہ لازم آئے گا۔“[3]

اگر طواف یا سعی میں کسی غلطی کی وجہ سے دم یا صدقہ لازم ہو جائے، تو اس طواف و سعی کا اعادہ یعنی اسے دوبارہ درست طریقے سے ادا کر لینے سے کفارہ معاف ہو جاتا ہے اور اگر اعادہ کیے

1…(الفتاوی الھندیہ، کتاب المناسک، جلد1، صفحہ247، مطبوعہ کوئٹہ)

2…(المسالک فی المناسک، فصل فی کفارۃ الجنایۃ فی الطواف، ج2، ص786، مطبوعہ دار البشائر الاسلامیہ، بیروت)

3…(فتاوی حج وعمرہ، حصہ9، ص68، مطبوعہ جمعیت اشاعت اھلسنت، پاکستان)

بغیر اپنے وطن واپس چلے جائیں، تو واپس آکر اعادہ کرنا بھی جائز ہے، لیکن کفارہ دینا افضل ہے۔
چنانچہ نور الدین علامہ علی قاری حنفی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات: 1014ھ/1605ء) فرماتے ہیں: ”(لو طاف فرضا أو نفلا علی وجه یوجب النقصان فعلیه الجزاء) أي دما أو صدقة (وإن أعاده سقط عنه الجزاء في الوجوه كلها والإعادة أفضل) أي ما دام بمكة (من أداء الجزاء) لأن جبر الشيء بجنسه أولی (ولو رجع إلی أهله) أي ولم يعده (فعليه العود أو بعث الجزاء) وهو أفضل من عوده۔۔۔ (ولو سعی كله او اكثره راكبا او محمولا بلا عذر فعليه دم۔۔۔ وان سعی اقله راكبا) و كذا محمولا (بلا عذر فعليه صدقة۔۔۔ واذا اعاده سقط)، ملخصا“ ترجمہ: اگر فرض یا نفل طواف اس طرح کیا کہ جس سے (اس کے واجبات میں) کوتاہی لازم آتی ہو، تو اس پر جزا یعنی دم یا صدقہ لازم ہے اور اگر اس کا اعادہ کر لے، تو تمام صورتوں میں اس سے جزا معاف ہو جائے گی اور جب تک مکہ شریف میں ہو، جزا دینے سے اعادہ افضل ہے، کیونکہ چیز کا نقصان اسی کی جنس سے پورا کرنا بہتر ہوتا ہے اور اگر اعادہ کیے بغیر اپنے وطن چلا گیا، تو اس پر واپس جا کر اعادہ کرنا یا جزا بھیج دینا لازم ہے اور یہ (جزا بھیجنا) واپس جانے سے افضل ہے۔۔۔ اور اگر مکمل یا اکثر سعی کسی مجبوری کے بغیر سواری پر یا کسی کے کندھوں پر کی، تو اس پر دم لازم ہے اور اگر چار سے کم چکر کسی مجبوری کے بغیر سواری پر اور اسی طرح کسی کے کندھوں پر کیے، تو اس پر صدقہ لازم ہے اور اگر اس کا اعادہ کر لیا، تو معاف ہو جائے گا۔[1]

صدر الشریعہ مفتی محمد امجد علی اعظمی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات:1367ھ/1947ء) فرماتے ہیں: ”طوافِ فرض کُل یا اکثر بلا عُذر چل کر نہ کیا، بلکہ سواری پر یا گود میں یا

1...(المسلک المتقسط علی لباب المناسک، ص392۔393، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

گھسٹ کر یا بے ستر کیا۔۔۔ تو ان سب صورتوں میں دَم دے اور صحیح طور پر اعادہ کر لیا، تو دَم ساقط اور بغیر اعادہ کیے چلا آیا، تو بکری یا اُس کی قیمت بھیج دے کہ حرم میں ذبح کر دی جائے، واپس آنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ سعی کے چار پھیرے یا زیادہ بلا عذر چھوڑ دیے یا سواری پر کیے، تو دَم دے اور حج ہو گیا اور چار سے کم میں ہر پھیرے کے بدلے صدقہ اور اعادہ کر لیا، تو دَم و صدقہ ساقط اور عذر کے سبب ایسا ہوا، تو معاف ہے۔ ملخصا“[1]

دم اور صدقے کی تفصیلات:

ایک دَم سے مراد ایک بکرا یا بکری قربان کرنا یا گائے یا اونٹ کا ساتواں حصہ قربان کرنا ہے اور اس قربانی کا حدودِ حرم میں ہونا ضروری ہے، چاہے خود کریں یا وہاں کسی کے ذریعے کروا دیں، جبکہ صدقے سے مراد صدقۂ فطر ہے اور طواف و سعی میں غلطی کرنے سے جب صدقۂ فطر لازم ہو، تو وہ ہر چکر کے بدلے میں الگ الگ واجب ہوتا ہے اور اس کی مقدار آدھا صاع یعنی دو کلو میں 80 گرام کم (تقریبا 1920 گرام) گندم، یا ایک صاع یعنی چار کلو میں 160 گرام کم (تقریبا 3840 گرام) کھجور یا جَو ہے۔ صدقے میں ان چیزوں کی قیمت بھی دی جا سکتی ہے اور گندم یا جَو کا آٹا یا ستو بھی دے سکتے ہیں۔ نیز صدقہ اپنے شہر کے شرعی فقیر (یعنی جسے زکوٰۃ دینا، جائز ہے، ایسے شخص) کو بھی دے سکتے ہیں، لیکن حرم شریف میں موجود شرعی فقیر کو دینا افضل ہے اور صدقہ جہاں بھی دے، بہر حال قیمت اس مقام کے حساب سے دینی ہو گی، جہاں صدقہ ادا کرنے والا ادائیگی کے وقت خود موجود ہو۔

ایک دَم سے مراد ایک بکرا یا بکری قربان کرنا یا گائے یا اونٹ کا ساتواں حصہ قربان کرنا

---

1 ...(بہارشریعت، حصہ6، ج1، ص1176۔1177، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ، کراچی)

ہے۔ چنانچہ ردالمحتار میں ہے:”قولہ (دم) فسرہ ابن ملک بالشاۃ۔۔۔وفی اضحیۃ القھستانی:لو ذبح سبعۃٌ۔۔۔فانہ یصح فی ظاھر الاصول، ملخصا“ **ترجمہ: دم کی تعریف ابنِ ملک نے بکری** سے کی ہے اور قہستانی کی کتاب الاضحیہ میں ہے کہ اگر ساتواں حصہ ذبح کیا، تو یہ بھی ظاہر اصول کے مطابق صحیح ہو گا۔[1]

دم حدودِ حرم میں دینا ضروری ہے۔ چنانچہ تنویر الابصار و در مختار میں ہے:”(ذبح) فی الحرم“ترجمہ: قربانی حرم میں کرے۔

اس کے تحت ردالمحتار میں ہے:”فلو ذبح فی غیرہ لم یجز“ترجمہ: تو اگر اس نے حرم کے علاوہ کسی اور جگہ قربانی کر دی، تو وہ اسے کافی نہیں ہو گی۔[2]

صدقے سے مراد صدقۂ فطر ہے اور صدقہ اپنے شہر کے شرعی فقیر کو بھی دے سکتے ہیں، لیکن حرم شریف میں موجود شرعی فقیر کو دینا افضل ہے۔ چنانچہ تنویر الابصار و درِ مختار میں ہے:”(تصدق بنصف صاع من بر) کالفطرۃ۔۔۔أین شاء، ملخصا“ترجمہ: صدقۂ فطر کی طرح آدھا صاع گندم صدقہ کرے، جہاں چاہے۔

ردالمحتار میں ہے:”(قولہ أین شاء) أي في غیر الحرم أو فیہ ولو علی غیر أھلہ لإطلاق النص، بخلاف الذبح والتصدق علی فقراء مکۃ أفضل، بحر“ترجمہ: شارح رحمۃ اللہ علیہ کا قول (جہاں چاہے) یعنی حرم کے علاوہ یا حرم میں، اگرچہ حرم کے فقیر کے علاوہ کسی دوسرے فقیر پر کیونکہ اس بارے میں نص مطلق ہے، جانور ذبح کرنے کے برخلاف اور صدقہ مکۃ المکرمہ کے

1...(ردالمحتار علی الدرالمختار، ج3، ص651، مطبوعہ کوئٹہ)

2...(ردالمحتار علی الدرالمختار، ج3، ص672، مطبوعہ کوئٹہ)

فقیروں پر کرنا افضل ہے۔ بحر۔[1]

طواف و سعی میں غلطی کرنے سے جب صدقہ ٔفطر لازم ہو، تو وہ ہر چکر کے بدلے میں الگ الگ واجب ہوتا ہے۔ چنانچہ المسلک المتقسط علی لباب المناسک، فصل فی احکام الصدقہ میں ہے: "(کل صدقة تجب فی الطواف فھی لکل شوط نصف صاع)۔۔۔و کذا بترک شوط من السعی صدقة، ملخصا" ترجمہ: طواف میں واجب ہونے والے ہر صدقہ (کی مقدار) ہر چکر کے بدلے میں آدھا صاع (گندم) ہے اور سعی کا کوئی چکر چھوڑ دینے کے بدلے میں بھی اِسی طرح صدقہ ہے۔[2]

اسی میں فصل فی الجنایۃ فی السعی میں ہے: "(ان سعی اقله راکبا) و کذا محمولا (بلا عذر فعلیه صدقة) ای لکل شوط علی مافی منسک ابی النجا" ترجمہ: اگر (سعی کے) چار سے کم چکر کسی مجبوری کے بغیر سواری پر اور اسی طرح کسی کے کندھوں پر کیے، تو اس پر ایک صدقہ لازم ہوگا یعنی ہر چکر کے بدلے میں (الگ الگ)، جیسا کہ ابو نجا کی کتاب المنسک میں ہے۔[3]

صدقۂ فطر کی مقدار سے متعلق فتاویٰ عالمگیری میں ہے: "ھی نصف صاعٍ من بر او صاعٍ من شعیر او تمر و دقیق الحنطة و الشعیر و سویقھما مثلھما" ترجمہ: یہ گندم سے آدھا صاع یا جو یا کھجور سے ایک صاع ہے اور گندم اور جو کا آٹا اور ان کی مثل دونوں کا ستو۔[4]

صدقے میں ان چیزوں کی قیمت دینا بھی جائز ہے۔ چنانچہ لباب المناسک، فصل فی احکام

1...(ردالمحتار علی الدرالمختار، ج3، ص671-672، مطبوعه کوئٹه)

2...(المسلک المتقسط علی لباب المناسک، ص440، مطبوعه دارالکتب العلمیه، بیروت)

3...(المسلک المتقسط علی لباب المناسک، ص393، مطبوعه دارالکتب العلمیه، بیروت)

4...(الفتاوی العالمگیریة، ج1، ص210، مطبوعه کراچی)

الصدقۃ میں صدقے کی مقدار بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ”و یجوز اداء القیمۃ“ ترجمہ: اور (صدقے میں ان چیزوں کی) قیمت ادا کرنا بھی جائز ہے۔[1]

حالتِ احرام میں لازم آنے والا صدقہ جہاں بھی دے، بہر حال قیمت اس مقام کے حساب سے دینی ہوگی، جہاں صدقہ ادا کرنے والا ادائیگی کے وقت خود موجود ہو۔ چنانچہ فتاوی فقیہِ ملت میں ہے: ”ایامِ حج میں جو صدقہ واجب ہوتا ہے، اس میں اس مقام کی قیمت معتبر ہوگی، جہاں حاجی صدقہ دے۔“[2]

نوٹ: یہی فتوی پہلے وائرل کیا گیا تھا اور اس میں حکم یہ لکھا گیا تھا کہ نفلی طواف بغیر عذر کے سواری پر کرنے کی صورت میں دَم لازم آئے گا، لیکن پھر مزید تحقیق کرنے پر یہ نتیجہ سامنے آیا ہے کہ نفلی طواف میں یہ حکم نہیں ہے اور اس صورت میں دَم لازم نہیں آئے گا، بلکہ ہر چکر کے بدلے میں الگ الگ صدقہ لازم آئے گا، لہٰذا اُس پہلے والے فتوے سے ہم رجوع کرتے ہیں۔ اللہ کریم ہماری خطاؤں کو معاف فرمائے۔ آمین بجاہ خَاتَمِ النَّبِیّٖن صلی اللہ علیہ والہ وسلم

واللہ اعلم عزوجل **و رسولہ اعلم** صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

01ذو الحجۃ الحرام1444ھ/20جون2023ء

فتوی10:

طواف کے بھول کر آٹھ چکر لگا لیے تو کیا حکم ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ میں پاکستان

1...(المسلک المتقسط علی لباب المناسک، ص438، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

2...(فتاوی فقیہ ملت، ج1، ص359، مطبوعہ شبیر برادرز، لاھور)

سے عمرہ کرنے آیا ہوا ہوں۔ میں نے احرام وغیرہ باندھ کر طوافِ عمرہ شروع کیا، لیکن میں نے بھول کر آٹھ چکر لگا لیے اور میں یہ سمجھا کہ یہ ساتواں چکر ہی ہے، لیکن مجھے اس کا ظن غالب نہیں تھا، پھر میں ہوٹل آ گیا، یہاں قافلہ امیر نے بتایا کہ آپ چھ چکر مزید لگا کر ایک اور طواف مکمل کریں، ورنہ دم لازم ہو جائے گا۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا مجھ پر چھ چکر مزید لگانا لازم ہیں؟ جو میں نے طواف کر لیا ہے، وہ درست ہوا ہے یا نہیں؟ مجھ پر کوئی کفارہ لازم ہے یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

پوچھی گئی صورت میں آپ کا طواف درست ہو گیا، نہ ہی آپ پر مزید چھ چکر لگا کر ایک اور طواف پورا کرنا لازم ہے اور نہ ہی کوئی کفارہ وغیرہ، کیونکہ یہ تو اس وقت لازم ہوتا ہے جب کوئی ساتواں چکر یقینی طور پر مکمل ہو جانے کے بعد جان بوجھ کر یا محض وہم و وسوسہ کی وجہ سے آٹھواں چکر لگائے، جبکہ صورت مستفسرہ میں آٹھویں چکر کو ساتواں گمان کر کے مزید ایک چکر لگایا گیا ہے اور فقہائے کرام علیھم الرحمۃ کی تصریحات کے مطابق ایسی صورت میں طواف درست ہو جاتا ہے، لہٰذا نہ ہی مزید چھ چکر لگانا لازم ہے، نہ ہی کوئی کفارہ وغیرہ۔

بحر الرائق، درر الحکام اور مجمع الانہر میں ہے، بالفاظ متقاربۃ: ”واختلفوا في منعه للزيادة حتى لو طاف ثامنا، وعلم أنه ثامن اختلفوا فيه والصحيح أنه يلزم إتمام الأسبوع؛ لأنه شرع فيه ملتزما بخلاف ما إذا ظن أنه سابع ثم تبين له أنه ثامن فإنه لا يلزمه الإتمام؛ لأنه شرع فيه مسقطا لا ملتزما كالعبادة المظنونة كذا في المحيط“ ترجمہ: اور فقہائے کرام علیھم الرحمۃ کا طواف کے زیادہ چکر کی ممانعت میں اختلاف ہے، یہاں تک کہ اگر کسی نے آٹھواں چکر لگایا اور وہ یہ جانتا تھا کہ یہ آٹھواں چکر ہے، تو فقہائے کرام کا اس کے حکم میں اختلاف ہے اور صحیح یہ ہے کہ اب اس پر

سات چکر پورے کرنا لازم ہے، کیونکہ اس نے عبادت کا آغاز اپنے اوپر اس کو لازم کرتے ہوئے کیاہے، بر خلاف اس صورت کے کہ جب اس کا گمان ہو کہ یہ ساتواں چکر ہے، پھر بعد میں ظاہر ہوا کہ یہ تو آٹھواں چکر تھا، تو اس صورت میں سات چکر پورے کرنا لازم نہیں، کیونکہ اس نے اس صورت میں عبادت کا آغاز ساقط کرتے ہوئے کیاہے، التزام کرتے ہوئے نہیں، جیسا کہ مظنون عبادت کا معاملہ ہوتا ہے، ایسا ہی محیط میں ہے۔[1]

در مختار میں ہے: "(فلو طاف ثامنا مع علمه به) فالصحيح أنه (يلزمه إتمام الأسبوع للشروع) أي لأنه شرع فيه ملتزما بخلاف ما لو ظن أنه سابع لشروعه مسقطا لا مستلزما "ترجمہ: تو اگر کسی نے آٹھواں چکر لگایا باوجود اس کے کہ وہ جانتا تھا کہ یہ آٹھواں چکر ہے، تو صحیح قول کے مطابق اب اس پر سات چکر پورے کرنا لازم ہے، یعنی اس وجہ سے کہ اس نے طواف کا آغاز اپنے اوپر اس کو لازم کرتے ہوئے کیا ہے، بر خلاف اس صورت کے کہ جب اس کا گمان ہو کہ یہ ساتواں چکر ہے (تو اس صورت میں سات چکر پورے کرنا لازم نہیں) کیونکہ اس نے اس صورت میں طواف کا آغاز ساقط کرتے ہوئے کیاہے، التزام کرتے ہوئے نہیں۔

اس کے تحت رد المحتار میں ہے: "(قوله مع علمه به) أي بأنه ثامن لكن فعله بناء على الوهم أو الوسوسة لا على قصد دخول طواف آخر، فإنه حينئذ يلزم اتفاقا "ترجمہ: شارح علیہ الرحمۃ کا قول: اس شخص کے اس بات کو جاننے کے باوجود یعنی یہ جاننے کے باوجود کہ یہ آٹھواں چکر ہے، پھر بھی اس نے وہم یا وسوسہ پر بناء کرتے ہوئے یہ چکر لگایا، نہ کہ دوسرے طواف میں

---

1 ... (البحر الرائق، ج02، ص353، دار الکتاب الاسلامی) (درر الحکام، ج01، ص223، دار احیاء الکتب العربیہ) (مجمع الانہر، ج01، ص272، دار احیاء التراث العربی)

داخل ہونے کی نیت سے، تو اس صورت میں اس پر بالاتفاق سات چکر پورے کرنا لازم ہے۔[1]

بہار شریعت میں ہے: "طواف سات پھیروں پر ختم ہو گیا، اب اگر آٹھواں پھیرا جان بوجھ کر قصداً شروع کر دیا، تو یہ ایک جدید طواف شروع ہوا، اسے بھی اب سات پھیرے کرکے ختم کرے۔ یوہیں اگر محض وہم و وسوسہ کی بناپر آٹھواں پھیرا شروع کیا کہ شاید ابھی چھ ہی ہوئے ہوں، جب بھی اسے سات پھیرے کرکے ختم کرے۔ ہاں اگر اس آٹھویں کو ساتواں گمان کیا بعد میں معلوم ہوا کہ سات ہو چکے ہیں، تو اسی پر ختم کردے سات پورے کرنے کی ضرورت نہیں۔"[2]

واللہ اعلم عزوجل **ورسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

02ربیع الاول 1446ھ/07ستمبر 2024ء

فتوی 11:

طواف کے دو نفل پڑھے بغیر دوسرا طواف شروع کر دیا، تو کیا حکم ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ طواف کے بعد دو رکعتیں پڑھے بغیر دوسرا طواف کرنے کا کیا حکم ہے؟ نیز اگر کسی نے ایسا کیا، تو کیا اس پر دم یا کفارہ لازم ہو گا؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

1...(الدرالمختار مع ردالمحتار، ج02، ص496، دارالفکر، بیروت)

2...(بہار شریعت، ج01، ص1100، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

طواف کرنے کے بعد دو رکعت پڑھنا واجب ہے، اگر وقت مکروہ نہ ہو، تو طواف اور ان دو رکعتوں کے درمیان موالات (یعنی دو رکعتوں کا طواف کے فوراً بعد ادا ہونا) سنت ہے ،لہذا مکروہ اوقات کے علاوہ ایک طواف کی رکعتیں ادا کیے بغیر دوسرا طواف کرنا، مکروہ اور خلاف سنت ہے، کیونکہ اس سے طواف اور دو رکعتوں کے درمیان موالات کی سنت کا ترک لازم آئے گا، البتہ اس کی وجہ سے کوئی دم یا کفارہ لازم نہیں ہو گا، ہاں اگر مکروہ وقت ہو تو بغیر دو رکعت پڑھے دوسرا طواف کرنا بلا کراہت جائز ہے۔

لباب المناسک میں طواف کے بعد کی دو رکعتوں کے متعلق ہے: "وھی واجبۃ بعد کل طواف فرضا کان او واجبا او سنۃ او نفلا" یعنی دو رکعتیں ہر طواف کے بعد واجب ہیں، خواہ طواف فرض ہو یا واجب، سنت ہو نفل ہو۔[1]

ارشاد الساری میں مکروہات طواف کے بیان میں ہے: "(والجمع بین اسبوعین فاکثر من غیر صلاۃ بینھما) لما یترتب علیہ من ترک السنۃ وھی الموالاۃ بین الطواف وصلاتہ لکل اسبوع" یعنی دو یا دو سے زائد طوافوں کو درمیان میں نماز پڑھے بغیر جمع کرنا (مکروہ ہے) کیونکہ اس کی وجہ سے طواف کے ہر سات چکر اور اس کی نماز کے درمیان موالات کی سنت کا ترک لازم آئے گا۔[2]

فتاوی عالمگیری میں ہے: "ویکرہ لہ الجمع بین الاسبوعین بغیر صلاۃ بینھما" یعنی دو طواف کو اس طرح جمع کرنا، مکروہ ہے کہ ان کے درمیان نماز نہ ہو۔[3]

1...(لباب المناسک، صفحہ218، مطبوعہ بیروت)

2...(ارشاد الساری، صفحہ223، مطبوعہ بیروت)

3...(فتاوی عالمگیری، جلد1، صفحہ234، مطبوعہ کوئٹہ)

فتاوی رضویہ میں مکروہات طواف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''ایک طواف کے بعد جب تک اس کی رکعتیں نہ پڑھ لیں، دوسرا طواف شروع کر دینا (مکروہ ہے) مگر کراہت نماز کا وقت ہو، جیسے صبح صادق سے طلوع آفتاب یا نماز عصر پڑھنے کے بعد سے غروب آفتاب تک کہ اس میں متعدد طواف بے فصل نماز جائز ہیں۔''[1]

طواف کے نوافل نہ پڑھنے پر کوئی دم یا کفارہ لازم نہیں ہوتا، بلکہ نوافل ذمہ پر لازم رہتے ہیں، اس کے متعلق لباب المناسک میں ہے: ''ولو ترک رکعتی الطواف لا شئی علیه ولا تسقطان عنه وعلیه ان یصلیهما ولو بعد سنین'' یعنی اگر کسی نے طواف کی دو رکعت ترک کیں ، تو اس پر کچھ بھی لازم نہیں اور وہ رکعتیں (ذمہ سے) ساقط نہ ہوں گی اور اس پر لازم ہے کہ وہ دو رکعتیں پڑھے اگرچہ کئی سالوں بعد۔[2]

بہار شریعت میں ہے: ''سنت یہ ہے کہ وقتِ کراہت نہ ہو تو طواف کے بعد فوراً نماز پڑھے، بیچ میں فاصلہ نہ ہو اور اگر نہ پڑھی تو عمر بھر میں جب پڑھے گا، ادا ہی ہے قضا نہیں مگر بُرا کیا کہ سنت فوت ہوئی۔''[3]

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــہ

مفتی فضیل رضا عطاری

17 جمادی الثانی 1445ھ/01 جنوری 2023ء

1...(فتاوی رضویہ، جلد10، صفحہ745752، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاھور)

2...(لباب المناسک، صفحہ218، مطبوعہ بیروت)

3...(بہار شریعت، جلد1، صفحہ1103، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ، کراچی)

فتوی 12:

طواف کے دوران قرآن پاک کی تلاوت کرنا کیسا؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ طواف کرتے ہوئے قرآن کریم کی تلاوت کا کیا حکم ہے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

دوران طواف دیکھ کر یا بغیر دیکھے تلاوت قرآن کرنا، جائز تو ہے، البتہ افضل یہ ہے کہ اس دوران تلاوتِ قرآن کرنے کی بجائے ذکرواذکار میں مشغول رہیں۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے طواف کے دوران تلاوت قرآن کرنا ثابت نہیں ہے اور متوارث طریقہ بھی یہی ہے کہ طواف کرتے ہوئے ذکرودعامیں مشغول رہاجائے، فقہائے کرام نے اسی کو اَوْلیٰ قرار دیاہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: "عندالطواف الذکر افضل من القراءۃ کذافی السراجیۃ" یعنی طواف کرتے ہوئے ذکر کرنا قراءت کرنے سے افضل ہے، سراجیہ میں یوں ہی ہے۔[1]

ردالمحتار میں ہے: "اقول الحاصل من ھذہ النقول التی ذکرناھا آنفاان القراءۃ خلاف الاولی ، وان الذکر افضل منھا ماثوراً اَوْ لَا کماھومقتضی الاطلاق" یعنی میں کہتاہوں ہم نے جو نقول ابھی پیش کیں، ان کا حاصل یہ ہے کہ طواف میں قراءت کرنا خلافِ اَوْلیٰ ہے اور ذکر کرنا قراءت کرنے سے افضل ہے، چاہے ذکر ماثور ہو یا غیر ماثور، جیسا کہ اطلاق کا تقاضا ہے۔[2]

1...(فتاوی عالمگیری، جلد1، صفحہ227، مطبوعہ پشاور)

2...(ردالمحتارمع الدرالمختار، جلد3، صفحہ583، مطبوعہ کوئٹہ)

فتح القدیر میں ہے: "لم یثبت عنه فی الطواف قراءة بل الذکر وھوالمتوارث عن السلف والمجمع علیه فکان اولی" یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے طواف کرتے ہوئے قراءت کرنا ثابت نہیں، بلکہ ذکر کرنا (ثابت ہے) اور یہی اَسلاف کا طریقہ رہا ہے، اور اسی پر اِجماع ہے، لہٰذا ذکر ہی اَولیٰ ہے۔(1)

مناسک ملا علی قاری میں ہے: "(یکون فی طوافه۔۔۔ ذاکرا)۔۔۔ ھوافضل من قراءة القرآن من حیث عمله صلی اللہ علیه وسلم فی الاطوفة الواقعة فی حجه وعمرته" یعنی طواف میں ذکر کرتا رہے، طواف کے دوران ذکر کرنا قرآن کی تلاوت سے اس اعتبار سے افضل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حج و عمرے کے طوافوں میں یہی عمل کیا۔(2)

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

الجواب صحیح	کتبــــــــــــــــــہ
مفتی ابو محمد علی اصغر عطاری مدنی	المتخصص فی الفقہ الاسلامی
	فرحان احمد عطاری مدنی
	22ذوالحجۃ الحرام1443ھ/22جولائی2022ء

فتویٰ13:

طواف کے دوران وضو کرنے اور کوئی چیز کھانے کا حکم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ

(1) دوران طواف اگر وضو ٹوٹ جائے، تو وضو کے بعد نئے سرے سے طواف کرنا ہوگا یا جہاں سے چھوڑ کر جاؤں گا وہیں سے بنا کر سکتا ہوں یا وہی چکر حجر اسود سے دوبارہ شروع کرنا

1...(فتح القدیر، جلد2، صفحہ390، مطبوعہ کوئٹہ)

2...(ملتقطا مناسک ملا علی قاری، صفحہ190، مطبوعہ مکۃ المکرمہ)

ہو گا؟

(2) کیا دوران طواف کوئی چیز کھا سکتے ہیں؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

(1) طواف کے دوران وضو ٹوٹنے کی صورت میں دیکھا یہ جائے گا کہ کتنے چکر پورے کرنے کے بعد وضو ٹوٹا، اگر طواف کے چار سے کم چکر لگائے تھے کہ وضو ٹوٹ گیا اور وضو کرنے چلے گئے، تو اس صورت میں آپ کو اختیار ہو گا کہ واپس آکر اُسی پہلے طواف پر بِنا کریں یعنی جتنے پھیرے رہ گئے تھے صرف وہی کر لیں گے، تو طواف پورا ہو جائے گا، نئے سرے سے شروع کرنا ضروری نہیں، البتہ یہ بھی اختیار ہے کہ نئے سرے سے شروع کریں، اس میں بھی کوئی حرج نہیں اور اس صورت میں اُس پہلے طواف کو پورا کرنا ضروری نہیں۔ ہاں اگر چار یا زیادہ پھیرے کر لیے تھے، تو اب وضو کے بعد واپس آکر نئے سرے سے نہیں کر سکتے، جہاں سے چھوڑا تھا وہیں سے کرنا ہو گا۔ اور بِنا کی صورت میں حجرِ اسود سے شروع کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ جہاں سے چھوڑا تھا، وہیں سے شروع کرے۔

طواف کے دوران وضو کرنے چلا جائے، تو واپس آکر طواف پر بِنا کر سکتا ہے یا نہیں اس سے متعلق بہار شریعت میں در مختار اور رد المحتار سے ہے: "طواف کرتے کرتے نمازِ جنازہ یا نمازِ فرض یا نیا وضو کرنے کے لیے چلا گیا، تو واپس آکر اُسی پہلے طواف پر بِنا کرے یعنی جتنے پھیرے رہ گئے ہوں، انہیں کر لے طواف پورا ہو جائے گا، سرے سے شروع کرنے کی ضرورت نہیں اور سرے سے کیا جب بھی حرج نہیں اور اس صورت میں اس پہلے کو پورا کرنا ضرور نہیں اور بِنا کی

صورت میں جہاں سے چھوڑا تھا، وہیں سے شروع کرے حجرِ اسود سے شروع کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ سب اس وقت ہے جب کہ پہلے چار پھیرے سے کم کیے تھے اور اگر چار پھیرے یا زیادہ کیے تھے، تو بِنا ہی کرے۔"[1]

(2) دورانِ طواف کچھ کھانا، مکروہ ہے اور اگر اعتکاف کی نیت نہیں کی ہوئی، تو یہ ایک اور جرم ہوگا، کیونکہ مسجد میں غیر معتکف کا کھانا پینا ناجائز ہے۔

طواف کے مکروہات بیان کرتے ہوئے فتاوی رضویہ شریف اور بہار شریعت میں فرمایا: "طواف میں کچھ کھانا۔ پیشاب، پاخانہ یا ریح کے تقاضے میں طواف کرنا۔"[2]

علامی شامی رحمۃ اللہ علیہ نقل کرتے ہیں: "یکرہ النوم والأکل فی المسجد لغیر المعتکف" ترجمہ: مسجد میں معتکف کے علاوہ دوسرے شخص کو سونا اور کھانا، مکروہ ہے۔[3]

سیدی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں: "ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں ایک ضابطہ کلیہ عطا فرمایا ہے، جس سے ان سب جزئیات کا حکم صاف ہو جاتا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: "من سمع رجلا ینشد ضالۃ فی المسجد فلیقل لا ردھا اللہ علیک فان المساجد لم تبن لھذا۔ رواہ مسلم عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالٰی عنہ" (ترجمہ: جو کسی شخص کو سنے کہ مسجد میں اپنی گم شدہ چیز دریافت کرتا ہے، تو اسے چاہیے کہ وہ کہے اللہ تیری گمی چیز تجھے نہ ملائے، مسجدیں اس لئے نہیں بنیں۔ .... اور ظاہر ہے کہ

---

1 ...(بہار شریعت، ج1، حصہ6، ص1100، 1101، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

2 ...(فتاوی رضویہ، ج10، ص745، رضا فاونڈیشن، لاھور)(بہار شریعت، ج1، حصہ6، ص1114، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

3 ...(ردالمحتار، کتاب الصوم، باب الاعتکاف، ج2، ص448، دار الفکر، بیروت)

مسجدیں سونے، کھانے پینے کو نہیں بنیں، تو غیر معتکف کو اُن میں ان افعال کی اجازت نہیں اور بلاشبہ اگر ان افعال کا دروازہ کھولا جائے، تو زمانہ فاسد ہے اور قلوب ادب وہیبت سے عاری، مسجدیں چوپال ہو جائیں گی اور ان کی بے حرمتی ہو گی وکل ماادی الی محظور محظور (ہر وہ چیز جو ممنوع کام تک پہنچائے ممنوع ہو جاتی ہے۔)"[1]

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

الجواب صحیح
مفتی محمد ہاشم خان عطاری

کتبــــــــــــــــــــہ
المتخصص فی الفقہ الاسلامی
ابو صدیق محمد ابو بکر عطاری
03 رجب المرجب 1444ھ/26 جنوری 2023ء

فتوی 14:

طواف کے دوران فرض نماز پڑھنے چلا گیا، تو کیا حکم ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر طواف کے دوران فرض نماز کا ٹائم ہو جائے اور طواف کرنے والا نماز پڑھنے چلا جائے، تو واپس آکر جو پھیرے باقی رہ گئے تھے، وہی ادا کرے گا یا نئے سرے سے دوبارہ طواف کرے گا؟ رہنمائی فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق والصواب

صورتِ مسئولہ میں طواف کرنے والے نے اگر پہلے چار پھیروں سے کم کیے تھے، تو اب اسے اختیار ہے، چاہے تو وہیں سے طواف شروع کرے جہاں چھوڑا تھا اور چاہے تو نئے سرے

1...(فتاوی رضویہ، ج 8، ص 93، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

سے طواف کرے لیکن افضل اور مستحب یہی ہے کہ نئے سرے سے طواف کرے، ہاں اگر چار یا اس سے زیادہ پھیرے کر لیے تھے، تو اب طواف جہاں چھوڑا تھا، اسی کو مکمل کرے۔

چنانچہ مناسک ملا علی قاری میں طواف کے مستحبات کے باب میں ہے: "واستئناف الطواف لو قطعہ ای ولو بعذر، والظاھر انہ مقید بما قبل اتیان اکثرہ" جب طواف کو درمیان میں چھوڑ دیا اگرچہ کسی عذر کے سبب، تو نئے سرے سے طواف کرنا (مستحب ہے)، اور ظاہر یہ ہے کہ یہ حکم طواف کے اکثر پھیرے کرنے سے پہلے کے ساتھ مقید ہے۔[1]

یوں ہی ایک اور مقام پر شرعی معذور کے متعلق ہے: "وصاحب العذر الدائم ای حقیقۃ او حکما، اذا طاف اربعۃ اشواط، ثم خرج الوقت توضا۔۔ وبنی ای علیہ واتی بالباقی من الواجب، ولا شیء علیہ ای بفعلہ ذلک لترکہ الموالاۃ بعذر، والظاھر ان الحکم ذلک فی اقل من الاربعۃ الا ان الاعادۃ حینئذ افضل" جب دائمی معذور چاہے وہ حقیقتاً ہو یا حکماً نے طواف کے چار پھیرے کر لیے تھے اور نماز کا وقت نکل گیا، تو وضو کر کے اسی طواف پر بنا رکھے یعنی پہلے والے طواف کے جو پھیرے باقی رہ گئے تھے، ان کو بجالائے اور اس پر کوئی چیز لازم نہیں ہو گی یعنی اس کے یہ کام کرنے سے، کیونکہ اس نے موالات کو عذر کے سبب چھوڑا ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ یہ حکم چار پھیروں سے کم میں بھی ہو گا، مگر اس وقت نئے سرے سے طواف کرنا افضل ہے۔[2]

بہار شریعت میں ہے: "طواف کرتے کرتے نمازِ جنازہ یا نمازِ فرض یا نیا وضو کرنے کے لیے چلا گیا تو واپس آکر اُسی پہلے طواف پر بِنا کرے یعنی جتنے پھیرے رہ گئے ہوں، انہیں کرلے

1۔۔۔(مناسک ملا علی قاری، ص160، مطبوعہ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ)

2۔۔۔(مناسک ملا علی قاری، ص167، مطبوعہ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ)

طواف پورا ہو جائے گا، سرے سے شروع کرنے کی ضرورت نہیں اور سرے سے کیا جب بھی حرج نہیں اور اس صورت میں اس پہلے کو پورا کرنا ضرور نہیں اور بِنا کی صورت میں جہاں سے چھوڑا تھا، وہیں سے شروع کرے حجرِ اسود سے شروع کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ سب اس وقت ہے جب کہ پہلے چار پھیرے سے کم کیے تھے اور اگر چار پھیرے یا زیادہ کیے تھے، تو بِنا ہی کرے۔[1]

واللہ اعلم عزوجل **ورسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــــہ

مفتی فضیل رضا عطاری

12 رمضان المبارک 1443ھ/14 اپریل 2022ء

فتوی 15:

طوافِ وداع کیے بغیر طائف چلے گئے، تو کیا حکم ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے حج کے افعال مکمل کیے، لیکن ابھی طوافِ وداع نہیں کیا اور وہ زیارات کے لیے طائف چلا گیا، اس کے لیے کیا حکم ہے، کیا دم یا صدقہ لازم ہو گا؟ اور اگر وہ عمرے کا احرام باندھ کر مکہ شریف واپس آجائے اور عمرہ کرلے، تو کیا یہ کفارہ ساقط ہو جائے گا یا بہر صورت دینا ہی ہو گا؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملك الوهاب اللهم هداية الحق و الصواب

نفسِ مسئلہ جاننے سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ "طوافِ وداع" اس طواف کو کہتے ہیں جو

---

1 ...(بہار شریعت، ج 1، ص 1100، 1101، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

اپنے وطن واپسی کے وقت بیت اللہ شریف سے رخصت ہونے کے لیے کیا جاتا ہے، یہ آفاقی یعنی میقات کی حدود سے باہر رہنے والے لوگوں پر منٰی سے واپس آنے کے بعد میقات سے باہر جانے سے پہلے کرنا واجب ہے ، البتہ طوافِ وداع کا وقت طوافِ زیارت کے بعد شروع ہو جاتا ہے، طوافِ زیارت کے بعد کوئی بھی نفلی طواف کر لیا، تو وہ طوافِ وداع کے قائم مقام ہو جائے گا، جب کہ وطن واپسی کا پختہ ارادہ ہو، لہٰذا جو حاجی طوافِ زیارت کے بعد نفلی طواف کرلے اس کا طوافِ وداع ہو جائے گا، اس کے ذمہ طوافِ وداع واجب نہیں رہے گا، ہاں مستحب اور افضل یہ ہے کہ عین واپسی کے ارادے کے وقت باقاعدہ مستقل طوافِ وداع کی نیت سے یہ طواف کیا جائے، تاکہ آخری ملاقات بیت اللہ شریف کے ساتھ ہو۔

تمہیدی گفتگو سمجھنے کے بعد نفسِ مسئلہ کا جواب یہ ہے کہ آفاقی پر میقات سے باہر جانے سے پہلے طوافِ وداع کرنا واجب ہے، اگر کوئی شخص طوافِ وداع کرنے سے پہلے طائف وغیرہ زیارات کے لیے یا وطن واپسی کی غرض سے چلا گیا، تو جب تک میقات کی حدود سے باہر نہ گیا ہو، واپس آجائے اور اگر میقات کی حدود سے نکل گیا، تو اب اختیار ہے، خواہ عمرے کا احرام باندھ کر واپس آجائے اور عمرہ ادا کرنے کے بعد طوافِ وداع کرلے ، یا واپس نہ آئے اور دم ادا کرے۔ اگر عمرے کا احرام باندھ کر واپس آگیا اور عمرہ کی ادائیگی کے بعد طوافِ وداع کر لیا، تو دم ساقط ہو جائے گا۔

نبی کریم صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے طوافِ وداع کا حکم ارشاد فرمایا، چنانچہ صحیح مسلم، مسندِ احمد، ابو داؤد وغیرہا کتبِ احادیث میں ہے، واللفظ للآخر: ”عن ابن عباس قال: کان الناس ینصرفون في کل وجه، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: لا ینفرن أحد حتی یکون آخر

عهده الطواف بالبيت" ترجمہ: حضرت ابنِ عباس رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہ بیان کرتے ہیں کہ لوگ ہر طرف سے (بغیر طوافِ وداع کیے) چل دیتے تھے، تب رسول اللہ صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی واپس نہ جائے، یہاں تک کہ اس کا آخری کام بیت اللہ کا طواف ہو۔[1]

مذکورہ بالا حدیثِ پاک کی شرح میں امام شرف الدین نَوَوِی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات:676ھ/1277ء) لکھتے ہیں: "فيه دلالة لمن قال بوجوب طواف الوداع وأنه إذا تركه لزمه دم وهو الصحيح في مذهبنا وبه قال أكثر العلماء منهم الحسن البصري والحكم وحماد والثوري وأبو حنيفة وأحمد وإسحاق وأبو ثور" ترجمہ: اس حدیثِ پاک میں ان فقہائے کرام کی دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ طوافِ وداع واجب ہے، اگر کسی نے ترک کر دیا، تو دم لازم ہو گا، یہی قول ہمارے مذہب کے مطابق درست ہے، اکثر علما یہی فرماتے ہیں، جن میں امام حسن بصری، حکم، حماد، امام ثوری، امامِ اعظم، امام احمد، اسحاق اور ابو ثور رَحِمَهُمُ اللهُ السَّلَامُ وغیرہ شامل ہیں۔[2]

مبسوطِ سرخسی، بدائع الصنائع، ہدایہ، الاختیار، جوہرۃ النیّرہ، بحر الرائق وغیرہا کتبِ فقہ میں ہے، واللفظ للاوّل: "اعلم بأن الطواف أربعة ثلاثة في الحج وواحد في العمرة...والطواف الثالث طواف الصدر وهو واجب عندنا" ترجمہ: جان لو کہ طواف چار ہیں، تین حج میں اور ایک عمرہ میں، تیسرا طواف، جسے طوافِ صدر (اور وداع) کہتے ہیں، یہ ہمارے نزدیک واجب ہے۔[3]

1...(سنن ابوداؤد، کتاب المناسک، باب الوداع، جلد1، صفحہ289، مطبوعہ لاھور)

2...(المنهاج شرح صحیح مسلم، باب وجوب طواف الوداع، جلد9، صفحہ78، مطبوعہ بیروت)

3...(مبسوط سرخسی، کتاب المناسک، باب الطواف، جلد4، صفحہ34، مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت)

طوافِ وداع کے وقت کی تفصیل کے متعلق فتح القدیر، رد المحتار، بحر الرائق و غیرہا کتبِ فقہ **میں ہے**، واللفظ للاوّل: ”والحاصل أن المستحب فيه أن يوقع عند إرادة السفر، وأما وقته على التعيين فأوله بعد طواف الزيارة إذا كان على عزم السفر “ترجمہ: حاصل و خلاصہ یہ ہے کہ طوافِ وداع کا مستحب وقت خاص وہ موقع ہے، جب وطن واپسی کا پختہ ارادہ بن جائے، بہر حال اس کا وقت طوافِ زیارت کے بعد شروع ہو جاتا ہے، جب کہ وطن واپسی کا پختہ ارادہ ہو۔[1]

طوافِ زیارت کے بعد وطن واپسی پر کوئی بھی نفل طواف کر لیا، تو طوافِ وداع ادا ہو جائے گا، خاص طوافِ وداع کی نیت ہونا ضروری نہیں، اگرچہ بہتر یہ ہے کہ رخصت کے وقت باقاعدہ اس نیّت سے طواف کرے، چنانچہ درِ مختار میں ہے: ”فلو طاف بعد إرادة السفر ونوى التطوع أجزأه عن الصدر “ترجمہ: اگر کسی نے ارادۂ سفر کے بعد کوئی نفل طواف کیا، تو یہ طوافِ وداع کے لیے کافی ہے۔[2]

طوافِ وداع کیے بغیر طائف وغیرہ زیارات کے لیے یا وطن واپسی کی غرض سے چلے جانے والے شخص کے متعلق فتح القدیر، بدائع الصنائع، ہدایہ، الاختیار، جوہرۃ النیّرہ، بحر الرائق وغیرہا کتبِ فقہ **میں ہے**، واللفظ للاوّل: ”ولو نفر ولم يطف يجب عليه أن يرجع فيطوفه مالم يجاوز المواقيت بغير إحرام جديد، فإن جاوزها لم يجب الرجوع عينا، بل إما أن يمضي وعليه دم، وإما أن يرجع فيرجع بإحرام جديد لأن الميقات لا يجاوز بلا إحرام فيحرم بعمرة، فإذا رجع ابتدأ بطواف العمرة ثم بطواف الصدر ولا شيء عليه لتأخيره وقالوا: الأولى أن لا يرجع ويريق دما لأنه أنفع للفقراء وأيسر عليه لما فيه من دفع ضرر التزام الاحرام ومشقة الطريق “ترجمہ: اور اگر کوئی

1...(فتح القدیر، کتاب الحج، باب الاحرام، جلد2، صفحہ 503، مطبوعہ لبنان)

2...(درمختار مع ردالمحتار، کتاب الحج، جلد 3، صفحہ 622، مطبوعہ کوئٹہ)

طوافِ وداع کیے بغیر چلا گیا، تو جب تک میقات کی حدود سے نہ نکل گیا ہو، اس پر واپس آکر دوبارہ سے احرام باندھے بغیر طواف کرنا واجب ہے اور اگر میقات کی حدود سے نکل گیا، تو واپس آنا ہی ضروری نہیں، بلکہ اختیار ہے کہ چلا جائے اور دم ادا کرے یا (عمرے کا) احرام باندھ کر واپس آجائے، کیونکہ بغیر احرام کے میقات میں داخل نہیں ہوسکتے، تو وہ عمرے کا احرام باندھے اور مکہ شریف پہنچ کر پہلے عمرہ کرے، پھر طوافِ وداع کرے اور اس تاخیر کی وجہ سے اس شخص پر کچھ بھی لازم نہیں۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں: زیادہ بہتر یہ ہے کہ واپس نہ لوٹے، بلکہ دم ادا کرے، اس لیے کہ اس میں فقراء کا زیادہ فائدہ ہے اور اس کے لیے بھی آسان ہے کہ اس کو واپس آکر احرام باندھنے اور راستے کی مشقت نہیں کرنی پڑے گی۔[1]

صدر الشریعہ مفتی محمد امجد علی اعظمی رَحۡمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیۡہِ (سالِ وفات: 1367ھ/1947ء) لکھتے ہیں: ”جو بغیر طوافِ رخصت کے چلا گیا، تو جب تک میقات سے باہر نہ ہوا، واپس آئے اور میقات سے باہر ہونے کے بعد یاد آیا، تو واپس ہونا ضرور نہیں، بلکہ دَم دے دے اور اگر واپس ہو، تو عمرہ کا احرام باندھ کر واپس ہو اور عمرہ سے فارغ ہو کر طوافِ رخصت بجالائے اور اس صورت میں دَم واجب نہ ہوگا۔“[2]

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

01 ذیقعدۃ الحرام 1444ھ/22 مئی 2023ء

1 ...۔ (فتح القدیر، کتاب الحج، باب الاحرام، جلد 2، صفحہ 503، مطبوعہ لبنان)

2 ...۔ (بہارِ شریعت، حج کا بیان، جلد 1، صفحہ 1152، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ، کراچی)

فتوی 16:

نفلی طواف کے بعد بھی نمازِ طواف پڑھنا واجب ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں کہ عمرے کے طواف کے علاوہ سِلے ہوئے کپڑوں میں جو نفلی طواف کیا جاتا ہے، کیا اس کے بعد بھی دو رکعت پڑھنا واجب ہے یا نہیں؟ اگر کسی نے بھول کر یا لاعلمی کی بنا پر نہ پڑھی ہو اور وہ اپنے ملک واپس آ گیا ہو، تو کیا اب اس پر دم لازم ہو گا؟ یا کیا حکمِ شرع ہو گا؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملك الوهاب اللهم هداية الحق و الصواب

طواف کوئی بھی ہو (واجب یا نفل) اس کے سات چکر مکمل کرنے کے بعد دو رکعت نماز پڑھنا واجب ہے، اگر کسی نے نہ پڑھی، تو یہ ذمہ سے ساقط نہیں ہو گی، ادا ہی کرنی ہو گی، لیکن چھوڑنے سے راجح قول کے مطابق دم واجب نہیں ہو گا، البتہ افضل یہ ہے کہ نمازِ طواف مقامِ ابراہیم کے پاس ادا کی جائے، وہاں جگہ نہ ملے تو مسجد الحرام میں جہاں میسر ہو وہاں پڑھ لی جائے اور اگر کسی نے حدودِ حرم سے باہر اپنے ملک میں ادا کی، تو بھی جائز ہے، مگر بلا ضرورت ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

نوٹ: طواف مکمل کرنے کے بعد دو رکعت نمازِ طواف ادا کرنے میں اس بات کا لحاظ ضروری ہے کہ اوقاتِ ممنوعہ (طلوعِ آفتاب کے وقت، ضحوی کبریٰ کے وقت اور غروبِ آفتاب کے وقت) میں ادا نہ کی جائے، بلکہ ممنوع اوقات گزر جانے کے بعد ادا کی جائے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ”ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

قدم،فطاف بالبیت سبعا ثم صلی رکعتین۔قال وکیع یعنی: عند المقام ثم خرج الی الصفا"ترجمہ:رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور بیت اللہ کا سات بار طواف کیا،پھر طواف کی دو رکعتیں پڑھیں۔وکیع کہتے ہیں یعنی مقام ابراہیم کے پاس پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم صفا پہاڑی کی طرف نکلے۔[1]

نمازِ طواف کے وجوب اور اس کو ترک کرنے کی تفصیل کے متعلق علامہ شیخ سندھی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ لکھتے ہیں:"رکعتی الطواف وھی واجبۃ بعد کل طواف،فرضا کان او واجبا او سنۃ او نفلاولا تختص بزمان ولا مکان ولا تفوت "ترجمہ:طواف(کے بعد) کی دو رکعتیں ہر طواف کے بعد واجب ہیں،چاہے وہ طواف فرض ہو یا واجب ہو یا سنت ہو یا نفل ہو اور یہ(دو رکعتیں)کسی مخصوص وقت اور جگہ کے ساتھ خاص نہیں ہیں اور نہ ہی یہ قضا ہوتے ہیں۔[2]

حدودِ حرم سے باہر اپنے مُلک میں پڑھنے کے جواز کے بارے میں علامہ شیخ سندھی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ لکھتے ہیں:" فلو ترکھا لم تجبر بدم،ولو صلاھا خارج الحرم ولو بعد الرجوع الی وطنہ جاز "ترجمہ:اگر کسی نے ان کو ترک کیا،تو اس کی تلافی دم کے ساتھ نہیں کی جائے گی اور اگر کسی نے ان کو حدودِ حرم سے باہر ادا کیا،اگرچہ اپنے وطن میں لوٹنے کے بعد ادا کیا،تب بھی جائز ہے۔[3]

مزید ایک مقام پر لکھتے ہیں:"ولو ترك ركعتي الطواف لا شيء عليه، ولا تسقطان عنه، وعليه أن يُصليهما ولو بعد سنين "ترجمہ:اگر کسی نے طواف کی دو رکعتیں نہیں پڑھیں،تو

1...(صحیح البخاری،کتاب الحج،ج01،ص220،مطبوعہ کراچی)

2...(لباب المناسک،صفحہ114،مطبوعہ دارقرطبہ)

3...(لباب المناسک،صفحہ114،مطبوعہ دارقرطبہ)

اس پر کچھ بھی لازم نہیں ہو گا، وہ ذمہ سے ساقط نہیں ہوں گی، بلکہ چھوڑنے والے پر ان کو پڑھنا لازم ہو گا، اگرچہ کئی سال بعد پڑھے۔(1)

مقام ابراہیم کے پاس نوافل ادا کرنے کے افضل ہونے کے متعلق لباب المناسک مع المسلک المتقسط میں ہے:"(افضل الاماکن لادائھا خلف المقام) وفی معناہ ماحولہ من قرب المقام (ثم فی الکعبۃ) ای داخلھا"ترجمہ: نمازِ طواف ادا کرنے کے لیے افضل جگہ مقام ابراہیم کے پیچھے یعنی مقام ابراہیم کے قرب میں پھر (افضل جگہ) کعبہ کے اندر ہے۔(2)

امام کمال الدین ابنِ ھُمّام رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ لکھتے ہیں:"ثم یأتي المقام فیصلي عندہ رکعتین أو حیث تیسر من المسجد و ھي واجبۃ عندنا"(طواف مکمل کرنے کے بعد) پھر مقام ابراہیم کے پاس آکر دو رکعتیں نماز پڑھے یا مسجد حرام میں کسی اور جگہ پر جہاں آسانی ہو وہاں نماز پڑھے اور یہ نوافل ہمارے نزدیک واجب ہیں۔(3)

مکروہ وقت میں نماز ادا کرنے کی ممانعت سے متعلق صحیح بخاری شریف کی حدیثِ مبارک ہے:"عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ یقول سمعت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ واٰلہ وسلم یقول لا صلوٰۃ بعد الصبح حتیٰ ترتفع الشمس ولا صلوٰۃ بعد العصر حتیٰ تغیب الشمس"ترجمہ: حضرتِ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و اٰلہ و سلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ صبح کی نماز کے بعد نماز نہیں، یہاں تک کہ آفتاب بلند ہو جائے اور عصر کے فرض ادا کرنے کے بعد نماز نہیں یہاں تک

1...(لباب المناسک، صفحہ218، مطبوعہ دار قرطبہ)

2...(المسلک المتقسط مع لباب المناسک، فصل فی رکعتی الطواف، 220، مطبوعہ مکۃ المکرمہ)

3...(فتح القدیر، جلد2، صفحہ456، مطبوعہ دار الفکر، لبنان)

کہ سورج غروب ہو جائے۔[1]

صدر الشریعہ مفتی محمد امجد علی اعظمی رَحمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ لکھتے ہیں: "طواف کے بعد مقامِ ابراہیم میں آکر آیہ کریمہ ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ﴾ پڑھ کر دو رکعت طواف پڑھے اور یہ نماز واجب ہے، پہلی میں قُلْ یَا دوسری میں قُلْ ھُوَاللہ پڑھے بشرطیکہ وقتِ کراہت، مثلاً طلوع صبح سے بلندی آفتاب تک یا دوپہر یا نمازِ عصر کے بعد غروب تک نہ ہو، ورنہ وقتِ کراہت نکل جانے پر پڑھے۔"[2]

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

الجواب صحیح
مفتی محمد قاسم عطاری

کتبـــــــــــــــــــــــــــــــــــــــه
المتخصص فی الفقہ الاسلامی
عبدالرب شاکر عطاری مدنی
03محرم الحرام1446ھ/10جولائی2024ء

فتوی17:

نفلی طواف کے اکثر پھیرے چھوڑ دینے کا حکم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک اسلامی بہن نے نفلی طواف شروع کیا، دو پھیرے کیے تھے کہ طبیعت بگڑ گئی، تو طواف چھوڑ کر ہوٹل چلی گئی۔ ذہن یہ تھا کہ لیٹ نائٹ آکر مکمل کروں گی، لیکن رات میں اس اسلامی بہن کو ایام شروع ہو گئے اور دو دن بعد ان کا مدینے شریف جانے کا شیڈول تھا اور وہیں سے پاکستان کی فلائٹ تھی، تو

1...(صحیح البخاری، کتاب مواقیت الصلوٰۃ، جلد01، صفحہ82،83، مطبوعہ کراچی)

2...(بہارِ شریعت، ج2، ص1102، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ کراچی)

وہ اسلامی بہن گروپ شیڈول کے مطابق مدینہ شریف روانہ ہوگئی۔

پوچھنا یہ ہے کہ اس نے جو نفلی طواف شروع کر کے صرف دو پھیرے کیے، باقی ادھورا چھوڑ دیا تو کیا اس اسلامی بہن پر کوئی کفارہ لازم ہے؟ کیونکہ طواف نفلی تھا، عمرے کا فرض طواف نہیں تھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

پوچھی گئی صورت میں اس اسلامی بہن پر نفلی طواف کا اکثر حصہ چھوڑ دینے کے سبب دم لازم ہے۔

مسئلے کی تفصیل یہ ہے کہ نفل طواف، نفل نماز کی طرح ایک عبادت ہے۔ جس طرح نفل نماز شروع نہ کی جائے، تو لازم نہیں ہوتی، یوں ہی نفل طواف جب تک شروع نہ کیا جائے، وہ نفل رہتا ہے، لہٰذا اگر کوئی سرے سے نفلی طواف کرے ہی نہیں، تو اس پر کچھ لازم نہیں ہوگا، لیکن نفلی طواف جب شروع کر دیا جائے، تو مثلِ نماز اس کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے، اس کو ادھورا چھوڑ دینا ناجائز و گناہ ہے۔ نیز نفلی طواف تمام احکام میں طوافِ قدوم کی طرح ہے اور طوافِ قدوم چھوڑنے میں طوافِ رخصت چھوڑنے والا حکم جاری ہوگا کہ اگر اکثر حصہ یعنی چار یا اس سے زیادہ چکر چھوڑ دیے، تو دم لازم ہوگا اور اگر چار سے کم پھیرے چھوڑے، تو ہر پھیرے کے بدلے ایک صدقہ فطر لازم ہوگا۔ پوچھی گئی صورت میں اس خاتون نے چونکہ اکثر حصہ چھوڑ دیا تھا، لہٰذا اس پر دم لازم ہے۔

نوٹ: واضح رہے کہ جس نے نفل طواف شروع کر کے چھوڑ دیا، اس کو حکم ہوتا ہے کہ

جب تک مکہ میں ہے، تب تک اس طواف کے بقیہ پھیرے مکمل کرے، اگر باقی پھیرے مکمل کر لیے، تو کوئی چیز بھی لازم نہیں ہوگی، بلکہ یہ ترک ہی نہیں کہلائے گا، کیونکہ آدمی جب تک حدودِ حرم کے اندر ہے، وہ اس عمل کا تارک نہیں کہلائے گا۔ ہاں تاخیر کا حکم دیں گے اور طواف کو دو حصوں میں ادا کرنے کے احکام جو کتبِ مناسک میں مذکور ہیں، مرتب ہوں گے، لیکن اگر باقی پھیرے مکمل کیے بغیر میقات سے باہر چلا جاتا ہے، تو اب تارک کہلائے گا اور کفارہ لازم ہو گا، لیکن وہ ایسا کر سکتا ہے کہ واپس آکر بقیہ حصہ مکمل کرے۔ اس طرح لازم ہونے والا کفارہ ساقط ہو جائے گا اور اگر میقات سے تجاوز کر گیا، جیسے صورتِ مسئولہ میں خاتون نے کیا کہ مدینہ منورہ روانہ ہو گئی، تو اب فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ افضل یہ ہے کہ دم دے، واپس آکر بقیہ حصہ مکمل نہ کرے، لیکن اس صورت میں بھی اگر واپس آکر بقیہ حصہ ادا کر لے، تو کفارہ ساقط ہو جائے گا۔

نفلی طواف شروع کر دینے سے واجب ہو جاتا ہے، جیسا کہ مناسک ملا علی قاری میں ہے: "ویلزم ای اتمامه بالشروع فیه ای فی طواف التطوع و کذا فی طواف تحیة المسجد وطواف القدوم وقوله: بالشروع فیه ای بمجرد النیة کالصلاۃ ای کما تلزم الصلاۃ بالشروع فیها بالنیة مع تحقق سائر شروطها "یعنی نفلی طواف شروع کر دیا، تو اب اس کا پورا کرنا واجب ہو گیا، یہی حکم طواف تحیۃ المسجد اور طوافِ قدوم کا بھی ہے۔ اور شروع کرنے سے مراد نیت کرنا ہے، جیسے نفل نماز یعنی جیسے تمام شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے نماز کی نیت کر کے نماز شروع کی، تو اس کو پورا کرنا لازم ہو جاتا ہے (ایسے ہی طواف کا معاملہ ہے۔) [1]

نفلی طواف احکام میں طوافِ قدوم کی مثل ہے، جیسا کہ مناسک ملا علی قاری میں ہے:

---

1 ...(المسلک المتقسط فی المنسک المتوسط، ص 203، مطبوعہ مکۃ مکرمہ)

"وحکم کل طواف تطوع کحکم طواف القدوم "یعنی ہر نفل طواف کا حکم طواف قدوم والا ہے۔[1]

طوافِ قدوم شروع کرکے چھوڑدینے سے متعلق فتاوی شامی میں ہے:"لم یصرحوا بحکم طواف القدوم لو شرع فیه وترك اکثره او اقله والظاهر انه کالصدر لوجوبه بالشروع وقدمنا تمامه فی باب الاحرام "یعنی فقہاء نے اس بات کی صراحت نہیں فرمائی کہ اگر طواف قدوم شروع کرکے اکثر یا اقل پھیرے چھوڑ دیئے، تو کیا حکم ہو گا؟ ظاہر یہ ہے کہ اس کا حکم طواف رخصت والا ہو گا، کیونکہ طواف قدوم بھی شروع کرنے سے واجب ہو جاتا ہے، اس کی مکمل بحث ہم نے باب الاحرام میں ذکر کر دی ہے۔[2]

طوافِ قدوم کا اقل حصہ چھوڑ دیا، تو صدقہ لازم ہو گا اور اکثر حصہ چھوڑا، تو دم لازم ہو گا، جیسا کہ فتاوی شامی کے باب الاحرام میں لکھا ہے:"واما القدوم۔۔۔**لو ترك اقله تجب فيه صدقة ولو ترك اکثره يجب فيه دم** لانه الجابر لترك الواجب فی الطواف کسجود السهو فی ترك الواجب فی النافلة"یعنی اگر طواف قدوم کے اقل پھیرے چھوڑ دیئے، تو اس میں صدقہ لازم ہو گا اور اگر اکثر چھوڑ دیئے تو دم لازم ہو گا، کیونکہ طواف میں واجب کے ترک کا نقصان اسی طرح پورا کیا جاتا ہے، جیسے نفل نماز میں واجب کے ترک پر سجدہ سہو سے نقصان کو پورا کیا جاتا ہے۔[3]

نفلی طواف سات پھیروں سے کم کرنے سے متعلق شیخ الاسلام والمسلمین امام

1۔۔۔(المسلک المتقسط فی المنسک المتوسط، ص498، مطبوعہ مکۃ مکرمہ)

2۔۔۔(ردالمحتار مع الدرالمختار، ج3، ص665، مطبوعہ کوئٹہ)

3۔۔۔(ملتقطاً از ردالمحتار، ج3، ص581، مطبوعہ کوئٹہ)

اہلسنّت امام احمد رضا خان علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: ”طواف اگرچہ نفل ہو اس میں یہ باتیں حرام ہیں (پھر امام اہلسنت علیہ الرحمۃ نے آٹھ باتیں گنوائیں اور ان میں سے آخری بات ہے) سات پھیروں سے کم کرنا۔“[1]

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــــــــہ

مفتی ابو محمد علی اصغر عطاری مدنی

28 صفر المظفر 1445ھ/15 ستمبر 2023ء

فتوی 18:

نفلی طواف شروع کیا تو پورا کرنا لازم ہے؟ پورا نہیں کیا تو کیا حکم ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کسی خاتون نے نفلی طواف کے دو چکر کر کے چھوڑ دیئے، تو کیا خاتون پر اس نفلی طواف کو پورا کرنا ضروری ہے؟ اگر پورا نہیں کیا، تو کیا اس کے چھوڑنے پر کوئی کفارہ بھی ہو گا؟ کیونکہ عورت کو پریگننسی (Pregnancy) ہے، ساتواں مہینا ہے، کنڈیشن ایسی ہے کہ چلنا بہت مشکل ہے، مجبوری کے تحت چھوڑا ہے، جان بوجھ کر نہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق والصواب

نفلی طواف شروع کر دینے سے اُس کی ادائیگی ذمہ پر لازم ہو جاتی ہے اور اب اُس کو پورا کرنا واجب وضروری ہوتا ہے۔ جو شخص نفلی طواف شروع کر کے اسے پورا نہ کرے، تو چاہے یہ پورا نہ کرنا کسی عذر کی وجہ سے ہو یا بغیر عذر، بہر صورت اُس پر کفارہ لازم ہو گا، جس کی تفصیل یہ

---

1 ...(فتاوی رضویہ، ج 10، ص 744، رضا فاؤنڈیشن، لاھور)

ہے کہ طواف قدوم کی طرح اگر نفلی طواف شروع کرکے، اُس کے اکثر یعنی چار یا اس سے زائد پھیرے (چکر) ترک کر دیئے تو دَم لازم ہو گا اور اگر اقل یعنی چار سے کم ایک، دو یا تین پھیرے ترک کر دیئے، تو ہر پھیرے کے بدلے ایک صدقہ فطر لازم ہو گا، ہاں اگر نفلی طواف نامکمل تھا، لیکن پھر پورا کرلیا، تو چار پھیرے پورا کرلینے کی صورت میں دَم ساقط اور زائد پورا کرنے کی صورت میں صدقہ ساقط ہو جائے گا۔

مذکورہ تمہید کے بعد صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ جب اس خاتون نے نفلی طواف شروع کر دیا اور اس کے دو پھیرے بھی کر لیے، تو اب خاتون پر اُس طواف کے بقیہ پانچ پھیروں کو بھی پورا کرنا لازم ہے اور اس کو چھوڑ دینے سے دَم لازم ہو گا، ہاں طواف پورا کرلینے کی صورت میں دَم ساقط ہو جائے گا۔ اگر وہ خاتون اِس وقت مکہ شریف میں ہی ہوں، تو اُنہیں چاہیے کہ اِس نفلی طواف کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔ جہاں تک اُن کے لیے بحالتِ حمل چلنے میں دشواری کا معاملہ ہے، تو اس کا حَل یہ ہے کہ اولاً وہ طواف ایسے وقت کریں کہ جب رَش نہ ہو، پھر کسی مَحرم یا دوسری خاتون کے سہارے، آہستہ آہستہ چل کر ایک ایک پھیرا پورا کرتی جائیں، پھیروں کے درمیان اگر وقفہ کرکے تھوڑا آرام لینا چاہیں تو اِس کی بھی اجازت ہے کہ طواف کے پھیروں کو بغیر وقفہ دیئے، پے درپے کرنا سنت ہے اور بلا عذر ان کے درمیان طویل وقفہ دینا مکروہ ہے، لیکن اگر کسی عذر کی وجہ سے وقفہ دیا جائے، جیسے تھک جانے پر آرام کرنے کے لیے تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔

اور اگر خاتون کے لیے کسی بھی طرح چلنا ممکن نہ ہو یا چلنے میں ناقابل برداشت تکلیف ہوتی ہو، تو اب وہ خاتون اس عذر کی وجہ سے وہیل چیئر پر بھی طواف کرسکتی ہیں اور اس صورت

میں وہیل چیئر پر طواف کرنے کی وجہ سے اُن پر کچھ بھی کفارہ وغیرہ لازم نہیں ہوگا، کیونکہ عذر کی وجہ سے سواری پر طواف کرنا، جائز ہوتا ہے اور کوئی کفارہ بھی لازم نہیں ہوتا، **البتہ اگر خاتون اس نفلی طواف کو کسی بھی طرح مکمل نہ کریں یا پھر وہ اپنے وطن واپس آچکی ہوں، تو اب اُن پر دَم کی ادائیگی لازم ہوگی۔**

نفلی طواف شروع کردینے سے اس کو پورا کرنا لازم ہوجاتا ہے، جیسا کہ لباب المناسک اور اس کی شرح میں ہے: ”(ویلزم) أي إتمامه بالشروع فيه أي في طواف التطوع وكذا في طواف تحية المسجد وطواف القدوم، وقوله: بالشروع فيه أي بمجرد النية (كالصلاة) أي كما تلزم الصلاة بالشروع فيها بالنية مع تحقق سائر شروطها“ ترجمہ: نفلی طواف کو شروع کرنے سے اس کو پورا کرنا لازم ہوجاتا ہے، اور طوافِ تحیۃ المسجد اور طوافِ قدوم کا بھی یہی حکم ہے۔ اور ان کا قول طواف شروع کرنا یعنی صرف طواف کی نیت کرلینے سے اس کو پورا کرنا لازم ہوتا ہے، جیسے نماز دیگر شرائط کی موجودگی میں نیت کے ساتھ شروع کرلینے سے لازم ہوجاتی ہے۔[1]

نفلی طواف کا حکم طواف قدوم کی طرح ہے اور فقہائے کرام نے طواف قدوم کو طواف رخصت پر قیاس کرتے ہوئے اس کے ترک کا بھی وہی حکم بیان فرمایا ہے، جو طوافِ رخصت کو ترک کرنے کا حکم ہے یعنی اگر کوئی شخص طواف قدوم کے اکثر پھیرے ترک کرے، تو اس پر دَم لازم ہوگا اور اگر اقل یعنی چار سے کم پھیرے ترک کرے، تو ہر پھیرے کے بدلے صدقہ لازم ہوگا۔ اور یہی حکم نفلی طواف کا بھی ہوگا کہ طواف قدوم اور نفلی طواف دونوں ہی شروع کردینے سے واجب ہوجاتے ہیں۔

---

1 ...(لباب المناسک مع شرحہ، باب انواع الاطوفہ، صفحہ 203، مطبوعہ مکۃ المکرمہ)

نفلی طواف کا حکم طواف قدوم کی طرح ہے، جیسا کہ لباب المناسک میں ہے: ”وحکم کل طواف تطوع کحکم طواف القدوم“ ترجمہ: ہر نفلی طواف کا حکم طواف قدوم کے حکم کی طرح ہے۔[1]

طوافِ رخصت کو ترک کرنے کے متعلق تنویر الابصار مع در مختار میں ہے: ”(الواجب دم علی محرم بالغ...ترک طواف الصدر أو أربعة منه...وان ترك ثلاثة من سبع الصدر تصدق بنصف صاع من بر کالفطرة) یجب لکل شوط منه“ ملتقطاو ملخصاً ترجمہ: اس محرم بالغ پر دم واجب ہے جو طواف صدر مکمل یا اس کے (کم از کم) چار پھیرے ترک کر دے۔ اور اگر طواف صدر کے سات پھیروں میں سے تین پھیرے ترک کرے، تو ہر پھیرے کے بدلے صدقہ فطر کی طرح آدھا صاع گندم صدقہ کرے۔[2]

طواف قدوم کے ترک کا حکم بھی طواف رخصت والا ہے، جیسا کہ اس کے تحت علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ رد المحتار میں فرماتے ہیں: ”لم یصرحوا بحکم طواف القدوم لو شرع فیه و ترک اکثرہ أو اقله۔ والظاهر انه کالصدر لوجوبه بالشروع“ ترجمہ: فقہائے کرام نے اس بارے میں تصریح نہیں کی کہ اگر کسی نے طوافِ قُدوم شروع کیا اور اُس کے اکثر یا اقل پھیرے چھوڑ دیئے، تو کیا حکم ہے؟ ظاہر یہ ہے کہ یہ طوافِ صدر کی طرح ہے، کیونکہ یہ شروع کرنے سے واجب ہو جاتا ہے۔[3]

حاشیہ ارشاد الساری میں ہے: ”وفی ردالمحتار۔۔۔لو ترک اقله تجب فیه الصدقة، ولو

---

1 ...۔(لباب المناسک، فصل فی الجنایة فی طواف القدوم، صفحہ 498، مطبوعہ مکۃ المکرمہ)

2 ...۔(تنویر الابصار مع درمختار، جلد 3، صفحہ 665-671، مطبوعہ کوئٹہ)

3 ...۔(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، صفحہ 665، مطبوعہ کوئٹہ)

ترک اکثرہ یجب فیہ الدم لانہ الجابر لترک الواجب فی الطواف کسجود السھو فی ترک الواجب فی النافلۃ۔وقال العلامۃ طاھر سنبل:۔۔۔**وکذا کل طواف تطوع لانہ کا لقدوم لوجوبہ بالشروع**"ملتقطاً ترجمہ:رد المحتار میں ہے:اگر کسی نے طوافِ قدوم کے اقل پھیرے چھوڑے،تواُس پر صدقہ لازم ہو گا اوراگر اس کے اکثر پھیرے چھوڑے،تواُس پر دَم لازم ہو گا،کیونکہ طواف میں واجب چھوڑنے کی وجہ سے دَم اسی طرح لازم ہے،جیسے نفلی نماز میں واجب کوترک کرنے میں سجدۂ سہو لازم ہے۔اور علامہ طاہر سنبل نے فرمایا اور اسی طرح ہر نفلی طواف کا حکم ہے کیونکہ وہ طواف قدوم کی طرح شروع کرنے سے واجب ہو جاتا ہے۔[1]

نفلی طواف کے تمام یا اکثر پھیرے ترک کرنے کے بعد اگر اس کو ادا کرلیا، تودَم ساقط ہو جائے گا، جیسا کہ طوافِ صدر کے متعلق الاختیار لتعلیل المختار میں ہے:"وأما ترك طواف الصدر أو أربعة منه فلتركه الواجب، وللأكثر حكم الكل، ويؤمر بالإعادة ما دام بمكة ويسقط الدم"ترجمہ:بہر حال طوافِ صدر مکمل یا اس کے چار پھیروں کا ترک (تو اس پر دم کا حکم) واجب طواف کو ترک کرنے کی وجہ سے ہے اور اکثر کے لیے کُل کا حکم ہے اور جب تک طوافِ صدر کو ترک کرنے والا شخص مکہ میں ہو، تو اُسے طواف کرنے کا حکم دیا جائے گا اور (اگر وہ طواف کرلے تو) دم ساقط ہو جائے گا۔[2]

طواف کے پھیروں کا پے در پے ہونا سنت ہے،جیسا کہ لباب المناسک اور اس کی شرح کی فصل فی سُنن الطواف میں ہے:"(والموالاۃ) أی المتابعۃ (بین الاشواط) أی اشواط الطواف"ترجمہ:اور طواف کے پھیروں کے درمیان موالات یعنی پے در پے ہونا سنت ہے۔[3]

1...(حاشیۃ ارشاد الساری،فصل فی الجنایۃ فی طواف القدوم،صفحہ499،مطبوعہ مکۃ المکرمہ)

2...(الاختیار لتعلیل المختار،جلد1،باب الجنایات،صفحہ163،مطبوعہ حلبی،قاھرہ)

3...(لباب المناسک مع شرحہ،فصل فی سنن الطواف،صفحہ226،مطبوعہ مکۃ المکرمہ)

طواف کے پھیروں کے درمیان بلا عذر وقفہ کرنا، مکروہ ہے، عذر کی وجہ سے ہو، تو کوئی حرج نہیں، جیسا کہ رد المحتار علی الدر المختار میں ہے: ”إذا خرج لغير حاجة كره ولا يبطل فقد قال في اللباب ولا مفسد للطواف وعد من مكروهاته تفريقه أي الفصل بين أشواطه تفريقا كثيرا“ ترجمہ: جب کوئی شخص دورانِ طواف بغیر کسی حاجت کے چلا جائے (جس سے طواف کے پھیروں میں وقفہ ہو) تو یہ مکروہ ہے اور اس سے طواف باطل نہیں ہو گا۔ پس لباب میں فرمایا کہ یہ طواف کو فاسد کرنے والا نہیں۔ اور پھیروں کے درمیان تفریق یعنی زیادہ فاصلہ دینے کو طواف کے مکروہات میں شمار کیا ہے۔[1]

عذر کی وجہ سے سواری پر طواف کرنا، جائز ہے اور اس سے کوئی کفارہ لازم نہیں ہو گا، جیسا کہ مبسوط سرخسی میں ہے: ”إن طاف راكبا أو محمولا فإن كان لعذر من مرض أو كبر لم يلزمه شيء“ ترجمہ: اگر کسی نے عذرِ شرعی مثلاً: مرض یا بڑھاپے کے سبب سواری یا کسی کے کندھوں پر بیٹھ کر طواف کیا، تو اُس پر کچھ لازم نہیں۔[2]

واللہ اعلم عزوجل **ورسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

02 ربیع الاول 1445ھ/19 ستمبر 2023ء

فتوی 19:

کیا ایصال ثواب کے لیے نفلی طواف کر سکتے ہیں اور اس میں ایک چکر کافی ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ کیا مرحوم والدین کی طرف سے ایصالِ ثواب کے طور پر نفلی طواف کر سکتے ہیں؟ اگر کر سکتے ہیں، تو کیا سات

1۔۔۔(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 3، کتاب الحج، صفحہ 582، مطبوعہ کوئٹہ)

2۔۔۔(مبسوط سرخسی، جلد 4، صفحہ 45، مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت)

چکر پورے کرنے ہوں گے یا صرف ایک چکر ہی سے طواف ادا ہو جائے گا؟

نوٹ: والدین کی طرف سے اس کی کوئی وصیت وغیرہ نہیں تھی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملك الوهاب اللهم هداية الحق و الصواب

والدین یا دیگر مسلمانوں کے ایصالِ ثواب کے لیے کوئی بھی نیک کام مثلاً حج، عمرہ، طواف، نماز، روزہ، صدقہ وغیرہ کر سکتے ہیں اور اُس عمل کا ثواب انہیں پہنچا سکتے ہیں، خواہ وہ زندہ ہوں یا وفات پا چکے ہوں، لہٰذا پوچھی گئی صورت میں اپنے مرحوم والدین کو ثواب پہنچانے کی نیت سے نفلی طواف کرنا صرف جائز ہی نہیں، بلکہ اچھا عمل ہے۔

البتہ شرعی طور پر مکمل طواف نیتِ عبادت کے ساتھ خانہ کعبہ کے گرد سات چکر لگانے کا نام ہے اور اس کو ادھورا چھوڑ دینا، ناجائز و گناہ ہے اگرچہ وہ نفلی طواف ہو، کیونکہ نفلی طواف جب شروع کر دیا جائے، تو مثلِ نماز اس کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے، لہٰذا اگر کسی شخص نے نفلی طواف شروع کر کے اس کے اکثر یعنی چار یا اس سے زائد پھیرے چھوڑ دیے، تو دَم لازم ہو گا اور اگر چار سے کم، مثلاً ایک، دو یا تین پھیرے چھوڑ دیے، تو ہر پھیرے کے عوض ایک صدقہ فطر لازم ہو گا اور دونوں صورتوں میں رہ جانے والے پھیرے اگر مکمل کر لیے، تو پہلی صورت میں دَم اور دوسری صورت میں لازم ہونے والے صدقے ساقط ہو جائیں گے۔

کسی بھی نیک عمل کی برکت سے دوسرے کو فائدہ پہنچنے کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:﴿وَ الَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَ لَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ﴾ ترجمہ کنز العرفان: اور ان کے بعد آنے والے عرض کرتے

ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور ہمارے دل میں ایمان والوں کیلئے کوئی کینہ نہ رکھ، اے ہمارے رب! بیشک تو نہایت مہربان، بہت رحمت والا ہے۔[1]

مذکورہ بالا آیت کے متعلق تفسیر مظہری میں ہے: "قال السیوطی وقد نقل غیر واحد الاجماع علی ان الدعاء ینفع المیت ودلیله من القرآن قوله تعالی ﴿وَالَّذِیۡنَ جَآءُوۡ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا وَ لِاِخۡوَانِنَا الَّذِیۡنَ سَبَقُوۡنَا بِالۡاِیۡمَانِ﴾" ترجمہ: امام سیوطی رَحۡمَۃُ اللہِ تَعَالٰی عَلَیۡہ فرماتے ہیں: کئی علماء نے اس بات پر اِجماع نقل کیا ہے کہ دعا میت کو فائدہ دیتی ہے اور اس کی دلیل قرآن پاک سے اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے ﴿وَ الَّذِیۡنَ جَآءُوۡ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا وَ لِاِخۡوَانِنَا الَّذِیۡنَ سَبَقُوۡنَا بِالۡاِیۡمَانِ﴾ ہے۔[2]

سنن ترمذی کی حدیث پاک ہے: "عن عبداللہ بن بریدة، عن ابیه قال: کنت جالسا عند النبي صلی اللہ علیه وسلم اذ اتته امراة، فقالت: یا رسول اللہ، انی کنت تصدقت علی امي بجارية، وإنها ماتت. قال: وجب اجرك وردها علیك المیراث، قالت: یا رسول اللہ، انها كان علیها صوم شهر، افاصوم عنها؟ قال: صومي عنها. قالت: یا رسول اللہ، انها لم تحج قط، افاحج عنها؟ قال: نعم، حجي عنها" ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن بریدہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنۡہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں: میں نبی کریم صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی خدمت میں بیٹھا تھا کہ ایک عورت نے حاضر ہو کر عرض کی: یارسول اللہ صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم! میں نے اپنی ماں کو ایک لونڈی بطور صدقہ دی تھی اور وہ وفات پا گئیں، تو آپ صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ

1...(القرآن، پارہ 28، سورۃ الحشر، آیت 10)

2...(تفسیر مظہری، جلد 09، صفحہ 127، مطبوعہ کوئٹہ)

وَسَلَّمَ نے فرمایا: تمہارا ثواب ثابت ہو گیا، اور وراثت نے وہ (لونڈی) تمہیں لوٹا دی، اس نے عرض کی: یارسول اللہ صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ! ان کے ذمہ ایک ماہ کے روزے تھے، تو کیا میں ان کی طرف سے روزے رکھوں؟ آپ صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے فرمایا: تم ان کی طرف سے روزے رکھ لو، اس نے عرض کی: یارسول اللہ صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ! انہوں نے کبھی حج نہیں کیا، تو کیا میں ان کی طرف سے حج کروں؟ آپ صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے فرمایا: ہاں! تم ان کی طرف سے حج کر لو۔[1]

مذکورہ حدیث مبارکہ کے الفاظ "نعم حجی عنها" کے تحت علامہ علی قاری حنفی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات:1014ھ/1605ء) لکھتے ہیں: "ای سواء وجب علیها ام أوصت به أم لا" ترجمہ: یعنی خواہ ان پر حج واجب ہو، یا انہوں نے اس کی وصیت کی ہو یا بغیر وصیت کے (نفلی) حج ہو، (لہذا انکی طرف سے کر لو)۔[2]

علامہ علاؤالدین حصکفی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات:1088ھ/1677ء) لکھتے ہیں: "الاصل ان کل من اتی بعبادة ما، له جعل ثوابها لغیره وان نواها عند الفعل لنفسه" ترجمہ: قاعدہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو کوئی بھی عبادت کرے، اس کے لیے جائز ہے کہ اس کا ثواب کسی دوسرے کے لیے کر دے، اگرچہ ادائے عبادت کے وقت خود اپنے لیے اسے کرنے کی نیت کی ہو۔

مذکورہ عبارت کے الفاظ "بعبادة ما" کے تحت علامہ ابنِ عابدین شامی دِمشقی رَحْمَۃُ اللہ

1...(سنن الترمذی، جلد2، صفحہ47، مطبوعہ دار الغرب الاسلامی، بیروت)

2...(مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح، جلد4، صفحہ1359، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

تَعَالٰی عَلَیْہِ(سالِ وفات:1252ھ/1836ء)لکھتے ہیں:”ای سواء کانت صلاۃ او صوما او صدقۃ او قراءۃ اوذکرا أو طوافا او حجا او عمرۃ او غیرہ“ترجمہ: خواہ وہ عبادت نماز، روزہ، صدقہ، قراءت، ذکر، طواف، حج، عمرہ یا اس کے علاوہ کوئی اور (نیک کام) ہو۔[(1)]

صدر الشریعہ مفتی محمد امجد علی اعظمی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ(سالِ وفات:1367ھ/1947ء)لکھتے ہیں:”رہا ثواب پہنچانا کہ جو کچھ عبادت کی اُس کا ثواب فلاں کو پہنچے، اس میں کسی عبادت کی تخصیص نہیں ہر عبادت کا ثواب دوسرے کو پہنچا سکتا ہے، نماز، روزہ، زکاۃ، صدقہ، حج، تلاوت قرآن، ذکر، زیارت قبور، فرض و نفل سب کا ثواب زندہ یا مردہ کو پہنچا سکتا ہے۔“[(2)]

طواف کی تعریف کے متعلق التعریفات الفقہیہ میں ہے:”الطواف شرعا ھو الدوران حول البیت الحرام“ترجمہ: شرعی طور پر طواف خانہ کعبہ کے گرد چکر لگانے کا نام ہے۔[(3)]

نفلی طواف بھی ادھورا چھوڑنا، ناجائز و گناہ ہے، اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت امام احمد رضا خان رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ(سالِ وفات:1340ھ/1921ء)لکھتے ہیں:”طواف اگرچہ نفل ہو، اس میں یہ باتیں حرام ہیں:۔۔۔سات پھیروں سے کم کرنا (بھی ان میں شامل ہے۔)“[(4)]

نفلی طواف جب شروع کر دیا جائے، تو اس کو پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے، چنانچہ علامہ علی قاری حنفی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ(سالِ وفات:1014ھ/1605ء)لکھتے ہیں:”لو شرع فیہ او فی طواف التطوع یجب علیہ اتمامہ“ترجمہ: اگر کوئی طوافِ قدوم یا نفلی طواف شروع کر لے، تو اُس پر

1...(ردالمحتار مع الدرالمختار، جلد4، صفحہ12، مطبوعہ کوئٹہ)

2...(بہار شریعت، جلد1، صفحہ1201، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ، کراچی)

3...(التعریفات الفقھیۃ، صفحہ138، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت)

4...(فتاویٰ رضویہ، جلد10، صفحہ744، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاھور)

طواف کو مکمل کرنا واجب ہو گا۔[1]

نفلی طواف کا حکم طوافِ قدوم کی طرح ہے، جیسا کہ علامہ شیخ سندھی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات:993ھ/1585ء) لکھتے ہیں: ”حکم کل طواف تطوع کحکم طواف القدوم“ ترجمہ: ہر نفلی طواف کا حکم طوافِ قدوم کے حکم کی طرح ہے۔[2]

طوافِ قدوم کے اکثر یا اقل پھیرے چھوڑ دینے کا حکم طوافِ صدر کی طرح ہے، جیسا کہ علامہ علی قاری حنفی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات:1014ھ/1605ء) لکھتے ہیں: ”لو ترک بعضه لم اجد فيه تصريحاً ، وينبغي ان يكون الحكم كحكم في طواف الصدر، فانه وجب بالشروع“ ترجمہ: اگر کسی نے طوافِ قدوم کے بعض چکر ترک کیے، تو اس بارے میں حکم کی تصریح میں نے نہیں پائی اور چاہیے کہ اس میں ویسا ہی حکم ہو، جیسا طوافِ صدر میں حکم ہے۔[3]

علامہ ابنِ عابدین شامی دِمشقی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات:1252ھ/1836ء) لکھتے ہیں: ”لم يصرحوا بحكم طواف القدوم لو شرع فيه وترك اكثره او اقله؟ والظاهر أنه كالصدر لوجوبه بالشروع“ ترجمہ: فقہائے کرام نے اس بارے میں تصریح نہیں کی کہ اگر کسی نے طوافِ قدوم شروع کیا اور اس کے اکثر یا اقل پھیرے چھوڑ دیئے، تو کیا حکم ہے؟ اور ظاہر یہ ہے کہ طواف شروع کرنے کے سبب واجب ہونے کی وجہ سے یہ طوافِ صدر کی مثل ہے۔[4]

طواف شروع کر کے اس کے اکثر یا اقل پھیروں کو چھوڑ دینے کے متعلق المسلک المتقسط شرح المنسک المتوسط میں ہے: ”(من ترك طواف الصدر كله او اكثره فعليه شاة) اى لترك

1...(المسلک المتقسط شرح المنسک المتوسط، صفحہ 389، مطبوعہ کوئٹہ)

2...(لباب المناسک، صفحہ 217، مطبوعہ دار قرطبة)

3...(المسلک المتقسط شرح المنسک المتوسط، صفحہ 389، مطبوعہ کوئٹہ)

4...(حاشیۃ ابن عابدین، جلد 3، صفحہ 665، مطبوعہ کوئٹہ)

الواجب (وما دام في مكة يؤمر بان يطوفه ، وان ترك ثلاثة اشواط منه، فعليه لكل شوط صدقة) اى فيطعم ثلاثة مساكين، كل مسكين نصف صاع من بر "یعنی جو شخص مکمل یا اکثر طوافِ صدر چھوڑ دے، تو اس پر ترکِ واجب کی وجہ سے دم لازم ہو گا اور جب تک مکہ میں ہے اُسے طواف کرنے کا حکم دیا جائے گا۔ اور اگر طوافِ صدر کے تین پھیرے چھوڑ دے، تو ہر پھیرے کے عوض اس پر ایک صدقہ لازم ہو گا، یعنی وہ تین مساکین کو کھانا کھلائے گا، ہر مسکین کو نصف صاع گندم۔[1]

علامہ ابنِ عابدین شامی دِمشقی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات:1252ھ/1836ء) لکھتے ہیں:"اما القدوم۔۔۔لو ترك اقله تجب فيه صدقة ولو ترك اكثره يجب فيه دم لانه الجابر لترك الواجب في الطواف كسجود السهو في ترك الواجب في النافلة"یعنی اگر کسی نے طوافِ قدوم کے اقل چکر چھوڑے، تو اس پر صدقہ لازم ہو گا اور اگر اس کے اکثر چکر چھوڑے، تو اس پر دَم لازم ہو گا، کیونکہ طواف میں واجب چھوڑنے کی وجہ سے دَم اسی طرح ہے، جیسے نفلی نماز میں واجب کو ترک کرنے میں سجدۂ سہو لازم ہوتا ہے۔[2]

صدر الشریعہ مفتی محمد امجد علی اعظمی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات:1367ھ/1947ء) لکھتے ہیں:"طوافِ رخصت (جسے طوافِ صدر بھی کہتے ہیں، اس کا) کل یا اکثر ترک کیا، تو دَم لازم اور چار پھیروں سے کم چھوڑا، تو ہر پھیرے کے بدلے میں ایک صدقہ۔"[3]

دونوں صورتوں میں رہ جانے والے پھیرے اگر مکمل کر لیے، تو دَم یا صدقہ ساقط ہو

1...(المسلک المتقسط شرح المنسک المتوسط، صفحہ 388، مطبوعہ کوئٹہ)

2...(حاشیۃ ابن عابدین، جلد3، صفحہ 581، مطبوعہ کوئٹہ)

3...(بہارِ شریعت، جلد01، حصہ 06، صفحہ 1176، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ، کراچی)

جائے گا، جیسا کہ لباب المناسک میں ہے: ”فان اعادہ سقط عنہ الدم“ ترجمہ: لہٰذا اگر اس (یعنی اکثر رہ جانے والے پھیروں کا) اعادہ کر لیا، تو دَم ساقط ہو جائے گا۔[1]

المسلک المتقسط شرح المنسک المتوسط میں ہے: ”(وان اعادہ سقطت ای)الصدقة“ ترجمہ: اور اگر اس (یعنی اقل رہ جانے والے پھیروں کا) اعادہ کر لیا، تو صدقہ ساقط ہو جائے گا۔[2]

واللہ اعلم عزوجل **ورسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

21شوال المکرم1445ھ/30اپریل2024ء

1...(لباب المناسک، صفحہ214، مطبوعہ دار قرطبة)

2...(المسلک المتقسط شرح المنسک المتوسط، صفحہ383، مطبوعہ کوئٹہ)

سعی

فتوی20:

کیا سعی کے ساتوں پھیرے لگاتار کرنا ضروری ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ کیا سعی کے ساتوں پھیرے لگاتار کرنا ضروری ہے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

سعی کے ساتوں پھیرے لگاتار کرنا سنت ہے، بغیر کسی عذر کے سعی کے پھیروں میں زیادہ فاصلہ کرنا شرعاً مکروہ و ناپسندیدہ ہے۔

سعی کے پھیرے پے درپے کرنا سنت ہے، جیسا کہ "مناسك الملا علی القاری" میں ہے: "(فصل: فی سننه) ای سنن السعی، و ھی خمس۔۔۔۔۔(و الموالاۃ بین اشواطه)" "یعنی سعی کی سنتوں کا بیان اور وہ پانچ سنتیں ہیں:۔۔۔ انہی میں سے ایک سنت سعی کے پھیرے لگاتار کرنا بھی ہے۔[1]

سعی کے پھیروں کے مابین بغیر عذر کے فاصلہ کرنا مکروہ ہے، جیسا کہ فتاوی شامی میں ہے: "في اللباب: ولا مفسد للطواف وعد من مكروهاته تفريقه أي الفصل بين أشواطه تفريقا كثيرا وكذا قال في السعي بل ذكر في منسكه الكبير لو فرق السعي تفريقا كثيرا كأن سعى كل يوم شوطا أو أقل لم يبطل سعيه ويستحب أن يستأنف" ترجمہ: لباب میں ہے کہ طواف

---

1 ...(مناسک الملا علی قاری، ص254، مطبوعہ مکۃ مکرمہ، ملتقطاً)

کو فاسد کرنے والی کوئی چیز نہیں اور اس کے پھیروں کے مابین فاصلہ کرنے کو مکروہات میں شمار فرمایاہے یعنی طواف کے پھیروں کے مابین بہت زیادہ فاصلہ کرنا، مکروہ ہے۔ اسی طرح انہوں نے سعی کے بارے میں فرمایا بلکہ اپنی "منسک الکبیر" میں ذکر فرمایا کہ اگر کوئی شخص سعی کے پھیروں میں بہت زیادہ فاصلہ کرے، مثلا: وہ ہر دن میں ایک یا ایک سے بھی کم پھیرا لگائے، تو اس کی سعی باطل نہیں ہوگی، البتہ مستحب یہ ہے کہ وہ اُس سعی کو نئے سرے سے ادا کرے۔[1]

فتاوی رضویہ میں ہے: "سعی میں یہ باتیں مکروہ ہیں: بے حاجت اس کے پھیروں میں زیادہ فصل دینا مگر جماعت قائم ہو تو چلا جائے، یونہی شرکتِ جنازہ یا قضائے حاجت یا تجدید وضو کو اگرچہ سعی میں ضرور نہیں۔"[2]

و اللہ اعلم عزوجل و رسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــــــــــــــــہ

مفتی ابو محمد علی اصغر عطاری مدنی

06رمضان المبارک1446ھ/07مارچ2025ء

فتوی 21:

حج یا عمرہ کی سعی بے وضو کرنا کیسا؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کسی شخص نے بے وضو سعی کرلی، تو اس کی سعی ہو جائے گی یا نہیں؟ اور اس پر دم لازم آئے گا یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

1...(ردالمحتار مع الدرالمختار، کتاب الحج، ج03، ص582، مطبوعہ کوئٹہ)

2...(فتاوی رضویہ، ج10، ص745، رضا فاؤنڈیشن، لاھور)

سعی کے لیے طہارت شرط نہیں، لہذا اگر کسی نے بے وضو سعی کر لی، تو بھی ہو جائے گی اور کوئی کفارہ دم وغیرہ لازم نہیں ہو گا، البتہ مستحب یہ ہے کہ باوضو سعی کی جائے۔

بحر الرائق میں ہے: "السعي **محدثا** أو جنبا لا يوجب شيئا سواء كان سعي عمرة أو حج "حالت حدث یا جنابت میں سعی کرنا کسی چیز کو واجب نہیں کرتا، چاہے عمرہ کی سعی ہو یا حج کی۔[1]

حج و عمرہ کی وہ عبادات جن میں طہارت شرط نہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے فتاوی عالمگیری میں فرمایا: "كالسعي" جیسے سعی۔[2]

بہار شریعت میں ہے: "سعی کے لیے طہارت شرط نہیں۔"[3]

لباب المناسک میں سعی کے مستحبات کے بیان میں ہے: "(والطهارة عن النجاسة الحقيقية **والحكمية** كبرى **وصغرى**" اور نجاست حقیقی اور حکمی بڑی ہو یا چھوٹی (اس) سے پاک ہونا۔ ملخصا۔[4]

بہار شریعت میں ہے: "مستحب یہ ہے کہ باوضو سعی کرے۔"[5]

واللہ اعلم عزوجل **ورسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــــــــــــــــہ

مفتی فضیل رضا عطاری

16 جمادی الثانی 1445ھ/30 دسمبر 2023ء

1...(بحر الرائق، جلد 3، صفحہ 35 مطبوعہ کوئٹہ)

2...(فتاوی عالمگیری، جلد 1، صفحہ 499، مطبوعہ کوئٹہ)

3...(بہار شریعت، جلد 1، صفحہ 1109، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ، کراچی)

4...(لباب المناسک، صفحہ 198، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

5...(بہار شریعت، جلد 1، صفحہ 1110، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ، کراچی)

فتوی22:

حجِ تمتع میں حج کا احرام باندھنے سے پہلے کی گئی سعی کا حکم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں کہ حج تمتع کرنے والے نے عمرہ کے بعد احرام کھول دیا، اب وہ حج کا احرام باندھنے سے پہلے اگر نفلی طواف کرے اور اُس کے بعد حج کی سَعی کرلے، تو کیا یہ سَعی کفایت کرے گی؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

حج تمتع کرنے والے نے عمرہ کے بعد احرام کھول دیا اور اب وہ حج کا احرام باندھنے سے پہلے ہی نفلی طواف اور اُس کے بعد سَعی کرلے، تو یہ سَعی، حج کی سَعی کے لیے کفایت نہیں کرے گی، بلکہ طوافِ زیارت کے بعد دوبارہ حج کی سَعی کرنا ضروری ہوگا، کیونکہ فقہاء نے جو رخصت بیان فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ حج کا احرام باندھ کر نفلی طواف اور اس کے بعد حج والی سعی کرلے، یہ نہیں کہ احرام باندھے بغیر ہی نفلی طواف اور سعی کرلے۔

مسئلہ کی تفصیل یہ ہے کہ فقہائے کرام نے سَعی کی چند شرائط بیان کی ہیں، اُن میں سے حج کی سَعی کے لیے شرط ہے کہ وہ حالتِ احرام میں ہو، لہٰذا متمتع نے اگر طوافِ زیارت کے بعد سَعی کرنے کی بجائے، پہلے ہی سَعی سے فارغ ہونا ہو، تو پھر **اُس کے لیے حکم یہ ہوتا ہے کہ وہ حج کا احرام باندھنے کے بعد نفلی طواف کرے اور اُس کے بعد سَعی کرلے۔** اِس صورت میں کی جانے والی سَعی حالتِ احرام میں ہوگی، لہٰذا یہ سَعی طوافِ زیارت کے بعد والی سَعی کے حق میں کافی بھی ہوجائے گی، جبکہ پوچھی گئی صورت میں **حج کا احرام باندھنے سے پہلے** طواف اور سَعی کرنے کا ذکر

ہے، لہٰذا اِس طرح کی گئی سَعی کفایت نہیں کرے گی، کہ یہ سَعی احرام کے بغیر ہو گی۔

حج میں تقدیم السعی علی الوقوف **کی صورت میں صحتِ سَعی کے لیے احرام کا ہونا شرط ہے،** چنانچہ "لباب المناسك" میں ہے:"واما وجود الاحرام حالة السَعْی **فان كان سَعْيه للحج قبل الوقوف فيشترط وجوده**"ترجمہ:سَعی کی حالت میں احرام کے پائے جانے کے متعلق مسئلہ یہ ہے کہ اگر اُس کی سَعی حج کے لیے اور وقوفِ عرفات سے پہلے ہو، تو اُس سَعی میں احرام کا پایا جانا شرط ہے۔(کہ اِس احرام کے بغیر سَعی درست نہ ہو گی) (1)

تنبیہ! مذکورہ بالا جزئیہ ومسئلہ اُس صورت میں ہے کہ جب وقوفِ عرفات سے پہلے ہی سعی کر کے فارِغ ہونا ہو، تو احرام شرط ہے، البتہ اگر کوئی پہلے سعی نہ کرے، بلکہ طوافِ زیارت کے بعد ہی کرنا چاہے، تو اُس سعی میں احرام کا ہونا شرط نہیں، بلکہ احرام نہ ہونا سنت ہے، چنانچہ اِسی کتاب "لباب المناسك"میں چند سطور بعد ہے:"ان كان سعيه للحج بعد الوقوف فلا يشترط وجود الاحرام بل يسن عدمه"ترجمہ:اگر حج کی سعی وقوف وغیرہ کے بعد ہو، تو اُس میں احرام کا ہونا شرط نہیں، بلکہ احرام نہ ہونا سنت ہے۔(2)

متمتع کے حق میں تقدیمِ سعی کے متعلق دوسری جگہ بصراحت لکھا ہے:"ان اراد تقديم السَعْی علی طواف الزيارة يتنفل بطواف بعدالاحرام بالحج، يضطبع فيه ويرمل ثم يسعی بعده"ترجمہ:اگر (متمتع) سَعی کو طوافِ زیارت سے پہلے کرنے کا ارادہ رکھے، تو اسے چاہیے کہ **حج کا احرام باندھنے کے بعد نفلی طواف کرے،** اُس میں اضطباع اور رمل بھی کر لے اور

1...(لباب المناسک مع شرحہ، صفحہ 246، مطبوعہ المکۃ المکرمہ)

2...(لباب المناسک مع شرحہ، صفحہ 247، مطبوعہ المکۃ المکرمہ)

پھر اُس کے بعد سَعی کرلے۔(اِس طرح وہ پہلے ہی سَعی سے فارِغ ہو جائے گا۔)[1]

امامِ اہلِ سُنَّت ، امام اَحمد رضا خان رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ(سالِ وفات:1340ھ/1921ء)لکھتے ہیں:"مفرد و قارن توحج کے رمل وسَعی سے طواف قدوم میں فارغ ہولیے، مگر متمتع نے جو طواف وسَعی کیے،وہ عمرہ کے تھے،حج کے رمل وسَعی اُس سے ادا نہ ہوئے اوراس پر طواف قدوم ہے نہیں کہ قارِن کی طرح اُس میں یہ امور کرکے فراغت پالے،لہٰذا اگر وہ(متمتع) بھی پہلے سے فارغ ہو لینا چاہے،**توجب حج کا احرام باندھے گا اس کے بعد** ایک نفل طواف میں رمل وسَعی کرے اب اسے طواف زیارت میں اِن کی حاجت نہ ہوگی۔"[2]

اِسی طرح صدرالشریعہ مفتی محمد امجد علی اعظمی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ(سالِ وفات:1367ھ/1947ء)لکھتے ہیں:"اگر وہ(متمتع) بھی پہلے سے فارغ ہولینا چاہے،**توجب حج کا احرام باندھے اس کے بعد** ایک نفل طواف میں رمل وسَعی کرلے اب اسے بھی طوافِ زیارت میں ان امور کی حاجت نہ ہوگی۔"[3]

واللہ اعلم عزوجل **ورسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

18ذوالقعدۃ الحرام1443ھ/18جون2022ء

1...(لباب المناسک مع شرحہ، صفحہ265، مطبوعہ المکۃ المکرمۃ)

2...(فتاویٰ رضویہ، جلد10، صفحہ744، مطبوعہ رضافاؤنڈیشن، لاھور)

3...(بہارشریعت، جلد1، حصہ6، صفحہ1112، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

عمرہ

فتوی 23:

شوال میں عمرہ کرنے والے پر کیا حج فرض ہو جاتا ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ ماہ شوال میں ہم مدینہ شریف سے نماز عید الفطر پڑھ کر عمرہ کی نیت سے احرام باندھ کر مکہ شریف روانہ ہوئے اور عمرہ ادا کرنے کے بعد دو چار دن کے بعد مکہ شریف سے اپنے وطن پاکستان روانہ ہوئے۔ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ جس نے پہلے فرض حج ادا کر لیا ہو، وہ تو شوال میں مکہ شریف جا کر اپنے وطن واپس آسکتا ہے، لیکن جس نے ابھی فرض حج ادا نہیں کیا، وہ اگر ماہ شوال میں مکہ شریف کی حدود میں داخل ہو جائے، تو اب بغیر حج کیے واپس نہیں آسکتا۔ شرعی رہنمائی فرمائیں کہ کیا یہ بات درست ہے کہ جس نے فرض حج ادا نہیں کیا، وہ شوال کے مہینے میں مکہ شریف گیا، تو اب بغیر حج کیے واپس نہیں پلٹ سکتا؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

حج کی فرضیت کے لیے دیگر شرائط کے ساتھ ساتھ زادِ راہ پر قدرت ہونا شرط ہے، جسے استطاعت کے ساتھ بھی تعبیر کیا جاتا ہے اور زادِ راہ میں مکہ مکرمہ تک آنے جانے، وہاں رہنے کے خرچے پر نیز واپس اپنے وطن آنے کے زمانے تک اپنے اور اپنے اہل و عیال کے نان و نفقہ پر حاجت اصلیہ سے زائد قدرت ہونا ضروری ہے، لہٰذا ماہ شوال میں جو شخص مکہ مکرمہ میں موجود ہے اور اس کے پاس یہ تمام خرچے نہیں ہیں، تو اس پر حج فرض نہیں ہوا، پس حج کی ادائیگی

بھی اس پر لازم نہیں، تو وہ اپنے وطن واپس آسکتا ہے اور جب تک استطاعت نہ پائی جائے، اس پر حج کی ادائیگی کے لیے آنا لازم نہیں ہو گا اور اگر اس کے پاس یہ تمام خرچے ہیں، تو اس پر حج فرض ہو چکا اور اب اگر ویزہ نہ ہونے کی وجہ سے حکومت اسے نکال دے گی، تو اب وہ محصر کے حکم میں ہو جائے گا، تو اس سال وہ وطن واپس آجائے، اس وجہ سے وہ گنہگار نہیں ہو گا اور آئندہ سال اس پر حج کی ادائیگی لازم ہو گی۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ ترجمہ کنزالایمان: "اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا ہے جو اس تک چل سکے۔"[1]

اس آیت کے تحت حضرت صدرالافاضل مفتی سید محمد نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ارشاد فرماتے ہیں: "اس آیت میں حج کی فرضیت کا بیان ہے اور اس کا کہ استطاعت شرط ہے۔ حدیث شریف میں سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تفسیر زاد و راحلہ سے فرمائی زاد یعنی توشہ کھانے پینے کا انتظام اس قدر ہونا چاہئے کہ جا کر واپس آنے تک کے لیے کافی ہو اور یہ واپسی کے وقت تک اہل و عیال کے نفقہ کے علاوہ ہونا چاہئے۔"[2]

ملتقی الابحر میں حج کی شرائط بیان کرتے ہوئے فرمایا: "وقدرة زاد وراحلة ونفقة ذهابه وأيابه فضلت عن حوائجه الأصلية ونفقة عياله إلى حين عوده" ترجمہ: اور (حج کی شرائط میں سے ہے) سامان سفر اور سواری اور آنے جانے کے نفقہ پر قدرت ہونا جو کہ اس کی حاجات اصلیہ سے زائد ہو اور اس کی واپسی تک اس کے عیال کے نفقہ پر قدرت ہونا۔[3]

1...(سورہ اٰل عمران، پارہ 04، آیت 97)

2...(خزائن العرفان فی تفسیر القرآن)

3...(ملتقی الابحر مع مجمع الانہر، کتاب الحج، ج 01، ص 383، 386، مطبوعہ کوئٹہ)

بہار شریعت میں حج واجب ہونے کی شرائط بیان کرتے ہوئے ایک شرط بیان کی: ”سفر خرچ کا مالک ہو اور سواری پر قادر ہو۔۔۔ سفر خرچ اور سواری پر قادر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ یہ چیزیں اس کی حاجت سے فاضل ہوں یعنی مکان و لباس و خادم اور سواری کا جانور اور پیشہ کے اوزار اور خانہ داری کے سامان اور دَین سے اتنا زائد ہو کہ سواری پر مکہ معظمہ جائے اور وہاں سے سواری پر واپس آئے اور جانے سے واپسی تک عیال کا نفقہ اور مکان کی مرمت کے لیے کافی مال چھوڑ جائے اور جانے آنے میں اپنے نفقہ اور گھر اہل و عیال کے نفقہ میں قدرِ متوسط کا اعتبار ہے نہ کمی ہو نہ اِسراف۔ عیال سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا نفقہ اُس پر واجب ہے۔“[1]

فیصلہ جات شرعی کونسل میں درج ہے: ”کسی شخص نے ماہ شوال میں عمرہ کیا اور اس کے پاس ایام حج تک وہاں ٹھہرنے اور کھانے پینے کی استطاعت نہ ہو تو اس پر حج فرض نہیں، یونہی اہل و عیال کے نفقہ پر قدرت نہ ہو جب بھی حج فرض نہیں کہ استطاعت زاد اور نفقہ عیال شرط وجوب ہے۔۔۔ جو شخص کھانے پینے کی استطاعت نہ رکھتا ہو اگرچہ اس کے پاس حج تک کا ویزا ہو اس پر حج فرض نہ ہو گا۔۔۔ جو غنی مکہ مکرمہ میں ہے اور ایام حج تک وہاں ٹھہرنے کا ویزا نہیں اور شوال کا ہلال ہو چکا ہو تو شرائط وجوب ادا پائے جانے کی وجہ سے اس پر حج کی ادائیگی واجب ہو گی اور وہ حکم محصر میں ہو گا اور منع من السلطان کی وجہ سے وہ سال رواں حج نہ کر سکے تو گنہگار نہ ہو گا، البتہ سال آئندہ ادائیگی حج لازم ہو گی۔“[2]

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

الجواب صحیح
مفتی محمد ہاشم خان عطاری

کتبــہ
المتخصص فی الفقہ الاسلامی
محمد عرفان مدنی
30 رجب المرجب 1438ھ/17 اپریل 2018ء

---

1 ...۔ (بہار شریعت، ج 01، حصہ 06، ص 1040، 1039، مکتبۃ المدینہ)

2 ...۔ (فیصلہ جات شرعی کونسل، ص 234، 233، مرکز الدراسات الاسلامیۃ جامعۃ الرضا، بریلی شریف)

فتوی 24:

پہلا عمرہ کرنے کے بعد مزید عمرے کرنا افضل ہے یا طواف ؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس بارے میں کہ اگر عمرے کے لیے جائیں، تو پہلا عمرہ کرنے کے بعد مزید نفلی عمرے کرنا افضل ہے یا طواف کرنا؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

جن اوقات میں عمرہ کرنا، جائز ہے، ان میں نفلی عمرہ کرنا، نفلی طواف سے افضل ہے، کیونکہ عبادات میں سے افضل عبادت وہ ہے، جس میں مشقت زیادہ ہو اور طواف کی بنسبت عمرہ کرنے میں وقت بھی زیادہ صَرف ہوتا ہے اور مشقت بھی زیادہ ہے۔

حدیث میں ہے: "افضل العبادات احمزھا" ترجمہ: عبادات میں سے افضل وہ ہے، جس میں زحمت زیادہ ہو۔"[1]

حضرتِ علامہ مخدوم ہاشم سندھی علیہ الرحمۃ حیات القلوب میں فرماتے ہیں: "اختلاف کردہ اند علماء درانکہ عمرہ افضل است از طوافِ کعبہ در اوقاتِ جوازِ عمرہ یا آنکہ طواف افضل است از عمرہ و شیخ ابن حجر مکی گفتہ کہ معتمد آن است کہ عمرہ افضل است از طواف۔ و شیخ علی قاری گفتہ کہ اظہر آنست کہ طواف افضل است بواسطہ بودن او مقصود بذات و مشروعیت او در جمیع حالات، و این اختلاف وقتی است کہ برابر باشد مدت ہر دو، **اما اگر مدتِ عمرہ زیادہ باشد از مدتِ طواف، لا جرم عمرہ افضل باشد از طواف کما لا یخفی**" ترجمہ: جن اوقات میں عمرہ کرنا، جائز ہے، ان میں عمرہ کرنا طوافِ کعبہ سے افضل ہے یا طوافِ کعبہ عمرے سے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ شیخ ابن حجر مکی فرماتے ہیں کہ معتمد قول یہ ہے کہ

1...(المقاصد الحسنہ، جلد 1، صفحہ 130، مطبوعہ بیروت)

عمرہ ادا کرنا طواف سے افضل ہے اور شیخ ملا علی قاری نے فرمایا: اظہر قول یہ ہے کہ طواف افضل ہے کہ وہ مقصود بالذات اور تمام حالات میں مشروع ہے۔ **اور یہ اختلاف اس وقت ہے کہ جب دونوں کی مدت برابر ہو اور اگر عمرہ کی مدت طواف سے زیادہ ہو، تو پھر عمرہ یقیناً طوافِ کعبہ سے افضل ہے، جیسا کہ مخفی نہیں۔**"[1]

واللہ اعلم عزوجل **و رسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

08شوال المکرم1440ھ/12جون2019ء

فتوی 25:

عمرہ کرنے والا اگر مکہ مکرمہ پہنچ جائے اور عمرہ کرنے سے روک دیا جائے، تو اب کیا حکم ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ بہت سے عمرہ زائرین جو مکہ مکرمہ میں عمرہ کی ادائیگی کے لیے موجود ہیں، مگر حکومت وقت نے عمرہ کرنے پر پابندی عائد کر رکھی ہے، مطاف و مسعیٰ دونوں جگہیں بند ہیں، اندر جانے کی اجازت نہیں دی جارہی۔ اس صورت میں معتمرین کے لیے کیا حکم ہے؟ احرام کی پابندیوں سے آزاد ہونے کے لیے انہیں کیا کرنا چاہیے؟ اس کی وضاحت فرمادیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

جو لوگ عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ شریف آچکے، پھر حکومت کی طرف سے ان کو مطلقاً طواف سے روک دیا گیا، تو شرعاً یہ محصر ہیں کہ احصار جس طرح حج میں متحقق ہوتا ہے، اسی طرح

1 ...(حیاۃ القلوب فی زیارۃ المحبوب، صفحہ 236، مطبوعہ ادارۃ المعارف، کراچی)

عمرہ میں بھی ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ حج میں احصار، وقوف و طواف دونوں سے روکنا ہے، جبکہ عمرہ میں احصار صرف طواف سے روکنا ہے کہ عمرہ کا رکن طواف ہی ہے۔ نیز جس طرح احصار حل و آفاق میں ہو سکتا ہے یونہی حرم بلکہ مکہ میں بھی ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِۚ وَ لَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى یَبْلُغَ الْهَدْیُ مَحِلَّهٗؕ﴾ اور حج اور عمرہ اللہ کے لئے پورا کرو، پھر اگر تم روکے جاؤ تو قربانی بھیجو جو میسر آئے اور اپنے سر نہ منڈاؤ، جب تک قربانی اپنے ٹھکانے نہ پہنچ جائے۔[1]

صحیح بخاری میں ہے: ”عن نافع ان عبداللہ بن عمر حین خرج الی مکۃ معتمراً فی الفتنۃ قال ان صددتم عن البیت صنعنا کما صنعنا مع رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم فاھل بعمرۃ من اجل ان رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کان اھل بعمرۃ عام الحدیبیۃ“ حضرت نافع سے مروی ہے کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالی عنھما جب ایام فتنہ میں عمرہ کے لئے مکہ کی طرف نکلے تو فرمایا کہ اگر تمہیں بیت اللہ سے روک دیا جائے تو ہم وہی کریں گے جو ہم نے رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کی ہمراہی میں کیا۔ پھر عمرے کا احرام باندھا اس لئے کہ حدیبیہ کے سال رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے عمرے کا احرام باندھا تھا۔[2]

بدائع میں ہے: ”الاحصار کما یکون عن الحج یکون عن العمرۃ عند عامۃ العلماء“ علمائے عامہ کے نزدیک احصار جس طرح حج میں ہوتا ہے اسی طرح عمرہ میں بھی ہوتا ہے۔[3]

مناسک لملا علی القاری میں ہے: ”وفی العمرۃ ای والاحصار فیھا ھو المنع عن الطواف

1...(سورۃ البقرۃ، آیت 196)

2...(صحیح بخاری، ج1، ص331، مطبوعہ لاھور)

3...(بدائع الصنائع، ج3، ص190، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ)

ای بعد الاحرام بھا او بھما لا غیر اذ لیس فیھا رکن الا الطواف بخلاف الحج" اور عمرہ میں یعنی عمرہ میں احصار یہ روکنا ہے عمرہ کے احرام کے بعد یا حج و عمرہ کے احرام کے بعد طواف سے کیونکہ حج کے برخلاف عمرہ میں طواف کے علاوہ کوئی رکن نہیں۔[1]

امام زیلعی رحمۃ اللہ تعالی علیہ تبیین الحقائق میں فرماتے ہیں:" و من منع بمکۃ عن الرکنین عنھما فھو محصر یعنی ان منع بمکۃ عن الطواف و الوقوف بعرفۃ صار محصراً لانہ تعذر علیہ الوصول الی الافعال فکان محصراً کما اذا کان ذلک فی الحل قال رحمہ اللہ: والا لا ای ان لم یمنع عنھما بان قدر علی احدھما لا یکون محصراً۔۔۔و روی ان ابا یوسف قال: سالت ابا حنیفۃ عن المحصر یحصر فی الحرم قال: لا یکون محصراً" اور جو شخص مکہ میں حج کے دو، رکنوں سے روک دیا گیا تو وہ محصر ہے یعنی اگر وہ طواف کعبہ اور وقوف عرفہ سے روک دیا جائے تو وہ محصر ہو گا کیونکہ اس پر افعال تک پہنچنا مشکل ہو گیا پس وہ محصر ہو گا جیسا کہ یہ شخص حل میں ہو تا۔ مصنف امام نسفی رحمہ اللہ نے فرمایا: ورنہ نہیں یعنی اگر ان دونوں سے نہ روکا گیا اس طرح کہ ایک رکن پر قادر ہو تو وہ محصر نہیں ہو گا۔۔۔ اور امام ابو یوسف علیہ الرحمۃ سے روایت، آپ نے فرمایا: میں نے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالی علیہ سے اس محصر کے بارے میں پوچھا جسے حرم میں روک دیا گیا ہو۔ فرمایا: وہ محصر نہیں۔

مزید فرماتے ہیں:"الاول اصح و ھو التفصیل" پہلا قول زیادہ صحیح ہے اور وہ تفصیل والا ہے۔[2]

علامہ چلپی رحمۃ اللہ تعالی علیہ مذکورہ عبارت کے تحت فرماتے ہیں:" قولہ:(و ھو

1...(مناسک، ص412، مطبوعہ کراچی)

2...(تبیین الحقائق، ج2، ص415، مطبوعہ کراچی)

التفصیل)و ھو ان من منع عنھما بمکۃ کان محصراً و من قدر علی احدھما لا یکون محصراً اھ" اس کا قول: اور وہ تفصیل والا قول ہے۔ اور وہ یہ کہ جو حج کے دو رکنوں سے روک دیا جائے تو وہ محصر ہو گا اور جو شخص ان میں سے ایک پر قادر ہو تو وہ محصر نہیں ہو گا۔[1]

مناسک لملا علی القاری میں ہے: "و فی ھذہ المسالۃ خلاف بین الامام و ابی یوسف، حیث قال: سالتہ عن المحرم یحصر فی الحرم، فقال: لم یکن محصرا۔ قلت: الم یحصر النبی صلی اللہ تعالی علیہ وسلم و اصحابہ بالحدیبیۃ و ھی من الحرم فقال: نعم لکن کانت حینئذ دارالحرب، و اما الآن فھی دارالاسلام، و المنع فیہ عن جمیع افعال الحج نادر، فلا یتحقق الاحصار، وقال ابو یوسف: اما عندی فالاحصار بالحرم یتحقق اذا غلب العدو علی مکۃ حتی حال بینہ وبین البیت، یعنی او بینہ وبین الوقوف بعرفۃ، واقول: و لا یبعد من غیر العدو ایضاًبان حبسہ حاکم عنھما، و اما ما ذکرہ الطرابلسی من انہ اذا دخل مکۃ و احصر لا یکون محصراً ای شرعاً، فمحمول علی ما ذکر فی الاصل مطلقاً بخلاف ما ذکر محمد فی النوادر مفصلاً بقولہ: و ان کان یمکنہ الوقوف و الطواف لم یکن محصراً، و الا فھو محصر و قد قالوا: الصحیح ان ھذا التفصیل المذکور قول الکل علی ما ذکر الجصاص و غیرہ و صححہ القدوری، و صاحب الھدایۃ و الکافی و البدائع و غیرھم۔۔قال ابن الھمام: و الذی یظھر من تعلیل منع الاحصار فی الحرم تخصیصہ بالعدو، و اما ان احصر فیہ بغیرہ فالظاھر تحققہ علی قول الکل، و ھذا غایۃ التحقیق، و اللہ ولی التوفیق" اور اس مسئلہ میں امام اعظم اور امام ابو یوسف کے درمیان اختلاف ہے، چنانچہ امام ابو یوسف علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ میں نے امام اعظم علیہ الرحمۃ سے ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا جو حرم میں محصور ہو گیا کہ کیا وہ محصر ہو گا؟ تو آپ نے فرمایا

---

1 ...۔(حاشیۃ الشیخ الشلبی علی تبیین الحقائق، ج2، ص415، مطبوعہ کراچی)

محصر نہیں ہو گا۔ میں نے کہا کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنھم حدیبیہ میں محصور نہیں ہوئے؟ حالانکہ یہ حرم میں شامل ہے۔ فرمایا: ہاں، لیکن اس وقت (حرم شریف) دار الحرب تھا اور اب دار الاسلام ہے اور حج کے سارے افعال سے روک دیا جانا نادر ہے پس احصار متحقق نہیں ہو گا اور امام ابو یوسف علیہ الرحمۃ نے فرمایا: بہر حال میرے نزدیک احصار متحقق ہو گا جب مکہ شریف پر دشمن غالب آجائے حتی کہ محرم اور کعبہ شریف کے درمیان حائل ہو جائے یا محرم اور وقوف عرفہ کے درمیان حائل ہو جائے اور میں کہتا ہوں بعید نہیں کہ دشمن کے علاوہ کوئی اور شخص بھی حائل ہو جائے جیسا کہ حاکم ان دو رکنوں سے روک دے اور بہر حال جس کو طرابلسی نے ذکر کیا کہ جب کوئی شخص مکہ میں داخل ہو جائے اور روک دیا جائے تو وہ شرعا محصر نہیں کہلائے گا یہ اس پر محمول ہے جو اصل میں مطلقا ذکر کیا گیا برخلاف اس کے جو امام محمد علیہ الرحمۃ نے نوادر میں تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا کہ اگر وقوف عرفہ اور طواف ممکن ہو تو محصر نہیں ہو گا ورنہ محصر ہو گا اور فقہائے کرام نے فرمایا: صحیح یہ ہے کہ یہ مذکورہ تفصیل سب کا قول ہے اس کے مطابق جو امام جصاص وغیرہ نے ذکر کیا اور امام قدوری، صاحب ہدایہ، کافی بدائع وغیرہم نے اس کو صحیح قرار دیا۔ ابن ہمام نے فرمایا: اور وہ جو ظاہر ہے یعنی حرم شریف میں احصار کے ممنوع ہونے کی علت اس کی تخصیص دشمن کے ساتھ ہے اور اگر حرم شریف میں دشمن کے علاوہ کسی اور وجہ سے روک دیا تب بھی سب کے قول پر ظاہر یہی ہے کہ احصار متحقق ہو گا اور یہ انتہائے تحقیق ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ ہی توفیق کا مالک ہے۔[1]

نہایہ میں بھی تفصیلی قول کو صحیح قرار دیا۔ بحر میں فرمایا کہ نہایہ کی تصحیح اس طرف اشارہ ہے کہ تفصیلی قول کو نادر الروایہ قرار دینا اور "مکہ میں احصار نہیں" کے قول کو ظاہر الروایہ قرار

1...(مناسک، ص412، مطبوعہ کراچی)

دینا مردود ہے۔ چنانچہ بحر الرائق میں ہے:" و قد قیل فی المسالة خلاف بین ابی حنیفة و ابی یوسف و الصحیح ما تقدم من التفصیل۔ کذا فی النهایة۔ و هو اشارة الی رد ما فی المحیط حیث جعل ما فی المختصر من التفصیل روایة النوادر و ان ظاهر الروایة ان الاحصار بمکة عنهما لیس باحصار لانه نادر و لا عبرة به" اور کہا گیا ہے کہ اس مسئلہ میں امام اعظم اور امام ابو یوسف علیہما الرحمۃ کے درمیان اختلاف ہے اور صحیح تفصیل والا قول ہے جو پیچھے گزر چکا۔ اسی طرح نہایہ میں ہے اور یہ اشارہ ہے اس کے رد کی طرف جو محیط میں ہے اس حیثیت سے کہ صاحب محیط نے اس تفصیل کو جو مختصر میں ذکر کی گئی ہے روایت نوادر قرار دیا اور فرمایا ظاہر الروایہ یہ ہے کہ مکہ شریف میں ان دو ارکان سے روک دیا جانا شرعا احصار نہیں ہو گا کیونکہ یہ نادر ہے اور اس کا اعتبار نہیں ہوتا۔[1]

ہدایہ میں مزید ہے:" ومن احصر بمكة وهو ممنوع عن الطواف والوقوف فهو محصر)لانه تعذر عليه الاتمام فصار كما اذا احصر فی الحج(وان قدر على احدهما فليس بمحصر) اما على الطواف فلان فائت الحج يتحلل به والدم بدل عنه فی التحلل واما على الوقوف فلما بينا وقد قيل فی هذه المسئلة خلاف بين ابی حنيفة وابی يوسف رحمهما الله تعالى والصحيح ما اعلمتك من التفصيل والله تعالى اعلم" اور جو شخص مکہ میں محصور ہو گیا اس حال میں کہ وہ طواف زیارہ اور وقوف عرفہ سے روک دیا گیا تو وہ محصر ہے کیونکہ اس پر اتمام متعذر ہو گیا۔ پس یہ ایسے ہو گیا جیسا کہ وہ حج میں محصور ہو گیا اور اگر ان میں سے ایک رکن کے ادا کرنے پر قادر ہو تو وہ محصر نہیں ہو گا بہر حال طواف پر کیونکہ حج کو فوت کرنے والا اسی سے احرام سے باہر ہوتا ہے اور دم اس کا بدل ہے احرام کھولنے میں اور بہر حال وقوف پر اس کی جہ سے کہ جو

---

1 ...(بحرالرائق، ج3، ص100، مطبوعہ کوئٹہ)

ہم نے بیان کیا۔ اور کہا گیا کہ اس مسئلہ میں امام اعظم اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے درمیان اختلاف ہے اور صحیح وہ ہے جو میں نے تم کو تفصیلی بتایا۔ اللہ تبارک و تعالی خوب جانتا ہے۔[1]

محصر احرام سے باہر آنے کے لئے حدود حرم میں بکری، بکرا وغیرہ جانور کہ جو قربانی کے شرائط کے مطابق ہو، ذبح کرے۔ اگر خود نہیں کر سکتا یا خود کا حرم پہنچنا دشوار ہے، تو کسی دوسرے کو ایک بکری کی قیمت دے کر اپنا وکیل مقرر کر دے اور وہ اس قیمت سے بکری خرید کر اس کی طرف سے حدود حرم میں ذبح کر دے۔ جب بکری ذبح ہو جائے گی، تو اس کا احرام کھل جائے گا۔ یہ یاد رہے کہ قربانی ذبح ہونے سے پہلے اگر ممنوعات احرام میں سے کسی بھی جرم کا ارتکاب کیا، تو اس کے اعتبار سے صدقہ یا دم وغیرہ لازم ہو جائے گا، لہٰذا جب قربانی کے لئے کسی کو اپنا وکیل مقرر کرے، تو اس سے یہ بات طے کر لے کہ فلاں دن، فلاں وقت قربانی ذبح ہو گی۔ پھر اس وقت پر وکیل سے رابطہ کر کے اس بات کی تسلی بھی کر لے کہ اس کی طرف سے قربانی ہو گئی ہے۔ نیز احرام کے باہر آنے کے لئے قربانی کافی ہے حلق کروانا ضروری نہیں لیکن بعدِ قربانی اگر حلق کروا لیا جائے تو مستحسن ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے: "عن عکرمة قال فقال ابن عباس قد احصر رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم فحلق راسه و جامع نساءه و نحره هديه حتى اعتمر عاماً قابلاً" حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا: تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عمرے سے روکا گیا، تو آپ نے اپنے سر مبارک کا حلق کروایا اور اپنی ازواج سے ازدواجی تعلق قائم فرمایا اور جانور کو نحر کیا حتی کہ آئندہ سال عمرہ فرمایا۔[2]

1...(الهدایہ مع فتح القدیر، ج3، ص58، مطبوعہ کوئٹہ)

2...(صحیح بخاری، ج1، ص331، مطبوعہ لاھور)

عالمگیریہ میں ہے:”و اما حکم الاحصار فھو ان یبعث بالھدی او بثمنہ لیشتری بہ ھدیاً و یذبح عنہ مالم یذبح لا یحل و ھو قول عامۃ العلماء سواء شرط عند الاحرام الاھلال بغیر ذبح عند الاحصار او لم یشترط و یجب ان یواعد یوماً معلوماً یذبح عنہ فیحل بعد الذبح و لا یحل قبلہ حتی لو فعل شیئا من محظورات الاحرام قبل ذبح الھدی یجب علیہ ما یجب علی المحرم اذا لم یکن محصراً“ اور بہر حال احصار کا حکم یہ ہے کہ قربانی یا اس کی قیمت بھیجے تاکہ اس سے قربانی کا جانور خریدا جائے اور اس کی طرف سے ذبح کیا جائے۔ جب تک ذبح نہیں کیا جائے گا احرام نہیں کھلے گا اور یہی قول عامہ علماء کا ہے برابر ہے کہ احرام باندھتے ہوئے احصار کے وقت بغیر ذبح کے احرام کھولنے کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو اور واجب ہے کہ ایک معین دن کا وعدہ لے لے جس دن اس کی طرف سے ذبح کیا جائے گا پس ذبح کے بعد احرام کھولے، پہلے نہیں کھول سکتا حتی کہ اگر ذبح سے پہلے ممنوعات احرام میں سے کسی ممنوع کا ارتکاب کیا تو اس پر وہی واجب ہو گا جو محرم پر واجب ہوتا ہے جب وہ محصر نہ ہو۔[1]

عالمگیریہ میں حلق کے بارے میں ہے:”و اما الحلق فلیس بشرط للتحلل فی قول ابی حنیفۃ و محمد رحمھما اللہ تعالی و ان حلق فحسن کذا فی البدائع“ اور بہر حال حلق کروانا امام اعظم اور امام محمد رحمھما اللہ کے قول کے مطابق احرام سے باہر آنے کے لیے شرط نہیں ہے اور اگر حلق کروالیا تو اچھا کیا اسی طرح بدائع میں ہے۔[2]

یہ یاد رہے کہ احرام سے باہر ہونے کے بعد بہر حال اس پر اس عمرے کے بدلے میں

1...(فتاوی ھندیہ، ج1، ص255، مطبوعہ کوئٹہ)

2...(فتاوی ھندیہ، ج1، ص255، مطبوعہ کوئٹہ)

ایک عمرہ لازم ہے۔ عمر بھر جب اس عمرے کا موقع ملے اس عمرے کو ادا کرے۔ ہندیہ میں ہے: ”ثم اذا تحلل المحصر بالهدی و کان مفرداً بالحج فعلیه حجة و عمرة من قابل و ان کان مفرداً بالعمرة فعلیه عمرة مکانها “ پھر جب محصر قربانی کے ساتھ احرام کھولے گا اور وہ اج افراد کر رہا تھا تو اس پر اگلے سال حج اور عمرہ کی قضاء ہو گی اور اگر صرف عمرہ کر رہا تھا تو اس پر اس کی جگہ عمرہ کی قضاء ہو گی۔[1]

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

الجواب صحیح
مفتی فضیل رضا عطاری

کتبـــــــــــــــــــــــــــہ
ابو سعید محمد نوید رضا عطاری
13 رجب المرجب 1441ھ/09 مارچ 2020ء

فتوی 26:

ایک عمرے کا دم ادا نہیں کیا اور دوسرا عمرہ کر لیا تو کیا حکم ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس بارے میں کہ میں نے آج سے دو تین سال پہلے عمرہ کیا تھا، جس میں مجھ پر ایک دم لازم ہوا تھا، جو میں نے اب تک ادا نہیں کیا، نیت یہ تھی کہ ادا کر دوں گا، لیکن بھول گیا، اب میں کراچی سے عمرہ کے لیے آیا اور عمرہ ادا کر لیا، پوچھنا یہ ہے کہ کیا میرا عمرہ ادا ہو گیا یا اس تاخیر کے سبب مجھ پر مزید کوئی دم وغیرہ لازم ہو گیا ہے؟

نوٹ: سائل نے دم کے متعلق پوچھنے پر بتایا ہے کہ پچھلے عمرے میں انہوں نے ایک ہی مجلس میں ایک ساتھ دونوں ہاتھ پاؤں کے ناخن حالتِ احرام میں کاٹ لیے تھے۔

1...(فتاوی هندیه، ج1، ص255، مطبوعه کوئٹه)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

پوچھی گئی صورت میں اگر آپ نے عمرہ صحیح طریقے سے ادا کیا ہے، تو محض پچھلے عمرہ میں لازم ہونے والے دم کی ادائیگی میں تاخیر کرنے کے سبب اس عمرے میں کوئی حرج واقع نہیں ہو گا اور نہ ہی اس تاخیر کے سبب کوئی دم لازم ہے، کیونکہ دَم کے لازم ہوتے ہی فوراً اس کی ادائیگی کرنا واجب نہیں ہوتا، بلکہ اس میں تاخیر کی بھی اجازت ہے اور اس تاخیر کے سبب اس دوران ادا کیے جانے والے عمرے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ البتہ افضل یہ ہے کہ جتنا جلدی ہو سکے دَم کی ادائیگی کر کے اُسے اپنے ذمہ سے ساقط کر دیا جائے، لہٰذا آپ کو چاہئے کہ جو پچھلے عمرے کا دم لازم ہے، اس کو جلد از جلد حرم شریف میں ادا کر دیں۔

بدائع الصنائع اور رد المحتار میں ہے، واللفظ للآخر: ”في شرح النقاية للقاري: ثم الكفارات كلها واجبة على التراخي، فيكون مؤديا في أي وقت، وإنما يتضيق عليه الوجوب في آخر عمره في وقت يغلب على ظنه أنه لو لم يؤده لفات، فإن لم يؤد فيه حتى مات أثم وعليه الوصية به“ ترجمہ: علامہ علی قاری علیہ الرحمۃ کی شرح نقایہ میں ہے: پھر تمام کفارات کی ادائیگی علی التراخی واجب ہے، تو جس وقت بھی کفارہ دے دیا جائے ادا کرنا ہی کہلائے گا اور عمر کے آخری حصے میں ایسے وقت میں اس پر فوری ادا کرنے کا وجوب متوجہ ہو جائے گا، جبکہ اس کا ظن غالب یہ ہو کہ اگر اس نے اب ادا نہ کیا تو وقت ختم ہو جائے گا (یعنی اب کفارہ ذمہ پر باقی رہ جائے گا) تو اگر اس نے ایسے وقت میں ادا نہ کیا یہاں تک کہ مر گیا، تو وہ گنہگار ہو گا اور ایسے وقت میں اس پر اس کی ادائیگی کی وصیت کرنا لازم ہے۔[1]

---

1 ...(بدائع الصنائع، ج 05، ص 96، دار الکتب العلمیہ) (رد المحتار علی الدر المختار، ج 02، ص 543، دار الفکر)

شرح اللباب میں ہے: ”(اعلم أن الكفارات كلها واجبة على التراخي)وانما الفور بالمسارعة الى الطاعة والمسابقة الى اسقاط الكفارة افضل،لأن في تاخير العبادات آفات (فلا يأثم بالتاخير عن أول وقت الامكان ويكون مؤديا لا قاضيا في أي وقت ادىٰ)لما سبق من ان امره ليس محمولاً على فوره (وانما يتضيق عليه الوجوب في آخر عمره في وقت يغلب على ظنه ان لو لم يؤده لفات فان لم يؤد فيه فمات اثم ويجب عليه الوصية بالاداء (والافضل تعجيل اداء الكفارات)اي مسارعة للخيرات “ترجمہ: جان لو کہ تمام کفارے علی التراخی واجب ہیں، البتہ نیکی کے کاموں میں جلدی اور کفاروں کو ساقط کرنے میں سبقت کرنا افضل ہے، کیونکہ عبادات کی تاخیر میں آفات ہیں (لیکن چونکہ فوری ادائیگی واجب نہیں)لہذا ادائیگی پر قادر ہونے کے وقت سے تاخیر کرنے پر گنہگار نہیں ہو گا اور جس وقت بھی ادا کرے گا، ادا کرنے والا ہی کہلائے گا، قضا کرنے والا نہیں کیونکہ یہ بات گزر چکی ہے کہ کفارہ کی ادائیگی کا حکم فوری نہیں۔

البتہ عمر کے آخری حصے میں جب اسے ظن غالب ہو جائے کہ اگر اب اس نے ادا نہ کیا تو کفارہ ذمہ پر باقی رہ جائے گا، تو ایسی صورت میں اسی وقت کفارہ ادا کرنے کا وجوب متوجہ ہو گا اور اگر اس نے ادا نہ کیا اور مر گیا، تو گنہگار ہو گا اور کفارہ ادا کرنے کی وصیت کرنا اس پر واجب ہے۔ اور افضل یہ ہے کہ کفاروں کی ادائیگی جلد ہی کر دی جائے، نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے ہوئے۔[1]

واللہ اعلم عزوجل **ورسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

25ربیع الثانی 1446ھ/29اکتوبر 2024ء

---

1 ...(لباب المناسک مع شرحہ، باب فی جزاء الجنایات و کفاراتھا، صفحہ 423، دارالکتب العلمیہ)

فتوی 27:

عمرہ کرنے کی منت مانی، تو کیا اس کو پورا کرنا لازم ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے منت مانی کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا، تو میں عمرہ کروں گا، اب اس کا کام ہو چکا ہے، تو کیا اس پر شرعاً عمرہ کرنا لازم ہے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

کسی شخص نے یوں منت مانی کہ "اگر میرا فلاں کام ہو گیا، تو میں عمرہ کروں گا"، تو ایسی منت، منتِ شرعی ہے جس کو پورا کرنا لازم ہے۔

اس مسئلے کی تفصیل یہ ہے کہ منت کے لازم ہونے کی شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ جس چیز کی منت مانی گئی ہو، وہ عبادت مقصودہ ہو اور اس کی جنس میں سے کوئی چیز فرض یا واجب ہو، چونکہ عمرہ کرنا عبادت مقصودہ ہے اور اس کی جنس سے فرض حج کی ادائیگی بھی موجود ہے، لہٰذا شخصِ مذکور پر عمرہ کرنا لازم ہے۔

منت کے لازم ہونے کی شرائط بیان کرتے ہوئے امام حسن بن عمار شُرُنبلالی حنفی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات:1069ھ/1658ء) لکھتے ہیں: "(اذا نذر شیئا لزمہ الوفاء بہ اذا اجتمع فیہ) ای المنذور (ثلاثۃ شروط) احدھا (ان یکون من جنسہ واجب)۔۔۔(و) الثانی (ان یکون مقصودا) لذاتہ" ترجمہ: جب کوئی شخص کسی شے کی نذر (منت) مانے، تو اس منت کو پورا کرنا لازم ہے، جبکہ اس منت والے کام میں تین شرائط پائی جائیں: ان میں سے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کی

جنس سے کوئی کام شرعاً واجب ہو۔۔۔اور دوسری شرط یہ ہے کہ وہ بذات خود عبادت مقصودہ ہو۔[1]

عمرہ کی منت، منتِ شرعی ہے جس کو پورا کرنا لازم ہے، جیسا کہ شمس الائمہ، امام سَرَخْسی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ(سالِ وفات:483ھ/1090ء)لکھتے ہیں:"ولو جعل علیه حجة او عمرة او صوما او صلاة او صدقة او ما اشبه ذلك مما هو طاعة ان فعل كذا ففعل لزمه ذلك الذی جعله علی نفسه ولم یجب كفارة الیمین فیه فی ظاهر الروایة عندنا" ترجمہ: اگر کسی شخص نے (منت کے ذریعہ) حج، عمرہ، روزہ، نماز، صدقہ یا اس کی مثل عبادات میں سے کوئی چیز اپنے اوپر لازم کر لی (یہ کہہ کر) کہ اگر وہ فلاں کام کرے گا، پھر اس نے وہ کام کر لیا، تو جو اس نے اپنی ذات پر لازم کیا تھا، اُس کا کرنا ضروری ہو گا اور ظاہر الروایہ کے مطابق ہمارے نزدیک اس صورت میں قسم کا کفارہ بھی واجب نہیں ہو گا۔[2]

ملک العلماء علامہ کاسانی حنفی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات:587ھ/1191ء) لکھتے ہیں:"یصح النذر بالصلاة والصوم والحج والعمرة والاحرام بهما والعتق والبدنة والهدی والاعتکاف ونحو ذلك، لانها قرب مقصودة" ترجمہ: نماز، روزہ، حج، عمرہ، ان دونوں کے احرام، عتق، بدنہ، ہدی اور اعتکاف وغیرہ کی منت ماننا درست ہے، کیونکہ یہ قربتِ مقصودہ ہیں۔[3]

اسی طرح فتاوی عالمگیری میں ہے۔[4]

1...(نورالایضاح مع مراقی الفلاح، صفحہ 350-351، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ، کراچی)

2...(المبسوط، جلد 8، صفحہ 135، مطبوعہ مطبعۃ السعادہ، مصر)

3...(بدائع الصنائع، جلد 5، صفحہ 82، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت)

4...(الفتاوی الھندیۃ، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 65، مطبوعہ دارالفکر، بیروت)

صدر الشریعہ مفتی محمد امجد علی اعظمی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات:1367ھ/1947ء) لکھتے ہیں: "اگر (کسی کام کے کرنے کو) ایسی چیز پر معلق کیا کہ اس کے ہونے کی خواہش ہے، مثلاً: اگر میرا لڑکا تندرست ہو جائے، یا پردیس سے آجائے، یا میں روزگار سے لگ جاؤں، تو اتنے روزے رکھوں گا یا اتنا خیرات کروں گا، ایسی صورت میں جب شرط پائی گئی، یعنی بیمار اچھا ہو گیا، یا لڑکا پردیس سے آگیا، یا روزگار لگ گیا، تو اتنے روزے رکھنا یا خیرات کرنا ضرور ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ کام نہ کرے اور اس کے عوض میں کفارہ دیدے۔"(1)

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

25صفر المظفر 1445ھ/31اگست 2024ء

فتوی 28:

عورت کے لیے عمرہ کے بعد غسل کرنا اور احرام دھونا ضروری ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ عمرہ کرنے کے بعد عورت کے لیے غسل کرنا ضروری ہوتا ہے یا نہیں، اور ایک احرام سے ایک عمرہ کرنے کے بعد دوسرے عمرے کے لیے اس احرام کا دھونا ضروری ہے یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملك الوهاب اللهم هداية الحق والصواب

عمرہ اپنے افعال یعنی طواف وسعی کے بعد حلق یا تقصیر سے ہی مکمل ہو جاتا ہے، اس کے بعد غسل کرنا ضروری نہیں، ہاں نظافت کے لیے کر لینا اچھا ہے۔ عمرے کے بعد احرام کو دھوئے

1...(بہارِ شریعت، جلد2، حصہ 9، صفحہ 314، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ، کراچی)

بغیر دوسرے عمرے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں، لیکن دھو لینا مستحب ہے۔

عمرہ طواف و سعی سے فارغ ہو کر حلق یا تقصیر سے ہی مکمل ہو جاتا ہے، چنانچہ تحفۃ الفقہاء میں ہے: ”فإذا فرغ من السعي يحلق أو يقصر والحلق أفضل وقد تمت العمرة وحل له جميع المحظورات الثابتة بالإحرام“ ترجمہ: جب عمرہ کرنے والا (طواف اور) سعی سے فارغ ہو گیا، تو حلق کرے یا تقصیر کرے اور (مرد کے لیے) حلق افضل ہے اور عمرہ مکمل ہو گیا اور اس کے لیے تمام ممنوع کام جو احرام کی وجہ سے ثابت ہوئے، تو وہ سب جائز ہو جائیں گے۔[1]

اگر احرام کی چادریں نئی نہ ہوں، تو اسے دھو کر پہننا مستحب ہے، چنانچہ تنویر الابصار مع در مختار میں ہے: ”(يستحب) لمريد الإحرام (لبس إزار ورداء جديدين أو غسيلين طاهرين) “ترجمہ: اور احرام (مُحرم ہونے) کا ارادہ رکھنے والے کے لیے دو نئے یا دُھلے ہوئے پاک تہہ بند اور چادر کا پہننا مستحب ہے۔

اس کے تحت رد المحتار میں بحر الرائق کے حوالے سے ہے: ”وفي عدم غسل العتيق ترك المستحب بحر“ ترجمہ: اور پرانے احرام کو نہ دھونے میں مستحب کا ترک ہے۔[2]

لباب المناسک اور اس کی شرح میں ہے: ”(مستحباته ۔۔۔ لبس ثوبين جديدين أو غسيلين) تبعيدا عن النجاسة وتنزيها عن الوساخة فيفيد ان اصل لبس الازار والرداء سنة وبقية الاوصاف مستحبة“ ترجمہ: احرام کے مستحبات تو وہ دو نئے یا دھلے ہوئے کپڑوں کا پہننا ہے، اس کے نجاست سے دور ہونے اور میل کچیل سے بچے ہونے کی وجہ سے، تو یہ بات فائدہ دیتی

---

1 ...۔ (تحفۃ الفقہاء، جلد 1، باب الاحرام، صفحہ 403، دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

2 ...۔ (تنویر الابصار مع درمختار و رد المحتار، جلد 3، صفحہ 558، 559، دار المعرفہ، بیروت)

ہے کہ اصل ازار اور چادر کا پہننا سنت ہے اور بقیہ اوصاف مستحب ہیں۔[1]

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

30 جمادی الاولی 1446ھ/03 دسمبر 2024ء

1...۔(لباب المناسک مع شرحہ، صفحہ 102، دار الکتب العلمیہ، بیروت)

حج

فتویٰ 29:

حج کی ادائیگی میں تاخیر کرنے کا حکم نیز حجِ بدل کرانے کی اجازت کس کو ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ میرے والد صاحب کے پاس اتنی رقم تقریباً چار پانچ سال سے موجود ہے کہ جس سے وہ حج کر سکیں اور اُن پر حج فرض تھا، مگر ابھی تک انہوں نے حج نہیں کیا اور اب اُن کی عمر تقریباً 70 سال ہے اور شوگر، بلڈ پریشر اور ٹانگوں کے درد کی وجہ سے زیادہ پیدل نہیں چل سکتے، البتہ تھوڑی دیر چل سکتے ہیں اور خود سے سواری وغیرہ پر بھی بیٹھ سکتے ہیں، تو کیا وہ اپنی طرف سے حجِ بدل کرواسکتے ہیں یا ان پر خود حج کرنا ضروری ہے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملك الوهاب اللهم هداية الحق و الصواب

جان بوجھ کر بغیر کسی شرعی عُذر کے فرض حج کو ایک سال تک مؤخر کرنا گناہِ صغیرہ اور چند سال تک تاخیر کرنا گناہِ کبیرہ ہے، لہٰذا اِس تاخیر پر توبہ کی جائے۔ جب حج ادا کرنے پر قدرت ہو اور دیگر تمام شرائط موجود ہوں، تو فوراً یعنی اُسی سال حج کی ادائیگی فرض ہے، نبی پاک صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: فرض حج ادا کرنے میں جلدی کیا کرو، کیونکہ تم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ بعد میں اُسے کیا دشواری لاحق ہو جائے۔

اور جہاں تک سوال میں بیان کی گئی صورت کا تعلق ہے، تو آپ کے والد صاحب حجِ بدل نہیں کروا سکتے، بلکہ اُن پر فرض ہے کہ اپنا حج خود ادا کریں، کیونکہ فقہائے کرام نے حجِ بدل

کروانے کی اجازت ایسے شخص کو دی ہے، جو عاجز ہو اور (عجز کے ممکن الزوال ہونے کی صورت میں) اُس کا عجز (عاجز ہونا) موت تک باقی رہے، یعنی وفات تک وہ شخص حج کرنے پر قادر ہی نہ ہو، اس کی ایک صورت یہ ہے کہ شدید بڑھاپے یا شدتِ مرض کی وجہ سے حالت ایسی ہو چکی ہو کہ خود حج کرنے پر بالکل قدرت ہی نہ رکھتا ہو، جبکہ آپ کے والد صاحب کے لیے حج کرنے میں مشقّت ضرور ہے، لیکن وہ عاجز نہیں، کیونکہ فی زمانہ حج کا سفر قدرے آسان ہے، حَرَمین شریفین میں طواف، سَعْی اور دیگر مناسکِ حج کی ادائیگی کے لیے ویل چیئرز (Wheel chairs) اور دیگر سہولیات میسر ہیں، یونہی مکہ مکرمہ سے مدینہ منوّرہ آنے جانے کے لیے بھی بہترین سفری سہولیات موجود ہیں، لہٰذا اتنی سہولیات اور آسانیاں موجود ہوتے ہوئے آپ کے والد صاحب حج کی ادائیگی سے عاجز نہیں ہیں، اُن پر فرض ہے کہ اپنا حج خود ادا کریں۔

فرضیتِ حج کے بعد اُسی سال حج کرنا ضروری ہونے کے بارے میں حدیثِ مبارک میں ہے: "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من أراد الحج، فليتعجّل" ترجمہ: رسول اللہ صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: جو حج کا ارادہ رکھتا ہو، اسے چاہیے کہ اس (کو ادا کرنے) میں جلدی کرے۔[1]

اس حدیثِ مبارک کی شرح میں علامہ علی قاری حنفی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات: 1014ھ / 1605ء) لکھتے ہیں: " والأصح عندنا أن الحج واجب على الفور" ترجمہ: اور ہمارے نزدیک اصح یہی ہے کہ حج فوری طور پر ادا کرنا واجب ہے۔[2]

1...(سنن ابوداؤد، کتاب المناسک، جلد1، صفحہ254، مطبوعہ لاھور)

2...(مرقاۃ المفاتیح، کتاب المناسک، الفصل الثانی، جلد5، صفحہ436، مطبوعہ کوئٹہ)

اور مسند احمد بن حنبل میں ہے: ”عن ابن عباس قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعجّلوا إلی الحج یعنی الفریضۃ فان أحدکم لا یدری ما یعرض لہ“ ترجمہ: حضرت سیدنا عبد اللہ بن عباس رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْھُمَا بیان کرتے ہیں کہ رسول پاک صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: فرض حج ادا کرنے میں جلدی کیا کرو، کیونکہ تم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ بعد میں اُسے کیا دشواری لاحق ہو جائے۔ (1)

اِس روایت کو نقل کرنے کے بعد علامہ عبد الرؤف مناوی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات: 1031ھ) لکھتے ہیں: ”ذھب أبو حنیفۃ إلی وجوب فوریتہ تمسّکا بظاھر ھذا الخبر ولأنہ لو مات قبلہ مات عاصیا“ ترجمہ: ”امام اعظم ابو حنیفہ رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ اِس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فوراً حج کی ادائیگی کو لازم قرار دیتے ہیں، لہٰذا اگر حج کرنے سے پہلے مر گیا، تو گنہگار ٹھہرے گا۔ (2)

صدر الشریعہ مفتی محمد امجد علی اعظمی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات: 1367ھ / 1947ء) لکھتے ہیں: ”جب حج کے لیے جانے پر قادر ہو حج فوراً فرض ہو گیا **یعنی اُسی سال میں** اور اب تاخیر گناہ ہے اور چند سال تک نہ کیا تو فاسق ہے اور اس کی گواہی مردود مگر جب کرے گا، ادا ہی ہے، قضا نہیں۔“ (3)

حج فرض ہونے کے باوجود تاخیر کی صورت میں گنہگار ہونے کے بارے میں علامہ علاؤ الدین حصکفی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات: 1088ھ / 1677ء) لکھتے ہیں: ”فیفسق وترد شھادتہ

1...(مسندِ احمد، مسند عبد اللہ بن عباس، جلد 5، صفحہ 58، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالہ)

2...(فیض القدیر، جلد 3، صفحہ 250، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

3...(بہارِ شریعت، جلد 1، حصہ 6، صفحہ 1036، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ، کراچی)

بتاخیرہ ای سنینا لان تاخیرہ صغیرۃ وبارتکابہ مرۃ لا یفسق الا باصرار" ترجمہ: چند سال تک حج کو بلاوجہ مؤخر کرنے والے کو فاسق قرار دیتے ہوئے اُس کی شہادت یعنی گواہی کو رد کر دیا جائے گا، کیونکہ حج کو مؤخر کرنا گناہِ صغیرہ ہے اور تَفْسِیق (فاسق قرار دینا) صرف ایک دفعہ تاخیر کرنے سے نہیں، بلکہ اِصْرَار یعنی چند سال مؤخر کرتے رہنے پر کی جائے گی۔[(1)]

سیّدی اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت الشاہ امام احمد رضا خان رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات:1340ھ/1921ء) لکھتے ہیں:" اگر ایک سال بھی ایسا گزر گیا تھا کہ جاسکتا تھا اور نہ گیا، تو گنہگار ہوا، استغفار واجب ہے۔"[(2)]

حجِ بدل اُسی شخص کی طرف سے ہو سکتا ہے، جو خود ادا کرنے سے عاجز ہو، چنانچہ عِجْز کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ علی قاری حنفی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات:1014ھ/1605ء) لکھتے ہیں:" ان کل من وجب علیہ الحج وعجز عن الاداء یجب علیہ الاحجاج ... ویتحقق العجز بالموت والحبس والمنع والمرض الذی لا یرجیٰ زوالہ ای کالزمن والفالج وذھاب البصر ای بان صار اعمیٰ والعرج والھرم ای الکبر ای الذی لا یقدر علی الاستمساک معہ وعدم المحرم وعدم امن الطریق وکل ذلک اذا استمر الی الموت" ترجمہ: ہر وہ شخص جس پر حج فرض ہو اور وہ اس کی ادائیگی سے عاجز ہو، تو اس پر حجِ بدل کروانا واجب ہے اور اُس شخص کا عاجز ہونا ان صورتوں میں ثابت ہو گا، مرنے، قید ہو جانے، روک دیئے جانے اور ایسے مرض میں مبتلا ہونے کہ جس کے ختم ہونے کی امید نہ ہو، جیسے اپاہج ہونا، فالج ہو جانا، بینائی چلی جانا، لنگڑا ہونا یا اِس قدر زیادہ بڑھاپا آجانا کہ وہ شخص ضعفِ عمری کے سبب خود بلا سہارا کھڑے ہونے پر بھی قادر نہ رہے یا

1...(الدرالمختار مع ردالمحتار، کتاب الحج، جلد3، صفحہ520، مطبوعہ کوئٹہ)

2...(فتاویٰ رضویہ، جلد10، صفحہ709، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاھور)

(عورت کے لیے) محرم کے نہ ہونے یا راستہ پُر امن نہ ہونے کی صورت میں، (اِن سب کے ساتھ یہ بھی شرط) کہ یہ تمام اعذار موت تک باقی رہیں۔[1]

حجِ بدل کی شرائط بیان کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت الشاہ امام احمد رضا خان رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ لکھتے ہیں: "خود ادا سے عاجز ہو... عجز اگر ممکنُ الزوال تھا، مثل حبس و مرض، تو شرط ہے کہ **تادمِ مرگ دائم رہے**، اگر بعدِ حج خود قادر ہوا، خود ادا فرض ہو گی، بخلاف اس عجز کے کہ قابلِ زوال نہیں، جیسے نابینائی اگر بطور خرقِ عادت بعد اِحجاج زائل بھی ہو جائے اعادہ ضرور نہیں۔"[2]

واللہ اعلم عزوجل **و رسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

21 رجب المرجب 1443ھ/23 فروری 2022ء

فتوی 30:

گھر خریدنے کے لیے رکھی ہوئی رقم کی وجہ سے حج لازم ہو گا؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص کرائے پر رہتا ہے اور اس نے اپنی رہائش کے لیے گھر خریدنے کے لیے رقم جمع کی ہوئی ہے، جو اس قدر ہے کہ جس سے وہ حج کر سکتا ہے اور حج کے دن بھی آ گئے ہیں، تو کیا اُس شخص پر گھر خریدنے کے لیے رکھی ہوئی رقم کی وجہ سے حج لازم ہو گا؟

1...(المسلک المتقسط مع حاشیۃ ارشاد الساری، صفحہ 611، مطبوعہ مکۃ المکرمہ)

2...(فتاویٰ رضویہ، جلد 10، صفحہ 659، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاھور)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

پوچھی گئی صورت میں اس شخص پر حج کرنا ہی لازم ہے، حج کے علاوہ کسی اور کام میں وہ رقم خرچ کرے گا کہ جس سے ترکِ حج لازم آئے، تو وہ گنہگار ہو گا۔

التجرید للقدوری میں ہے: "ولو لم يكن له مسكن ومعه دراهم وهو محتاج الى مسكن لم يجز له ترك الحج" ترجمہ: اگر کسی کے پاس گھر نہیں ہے اور اس کے پاس درہم ہیں اور وہ گھر کا محتاج بھی ہے، تو حج چھوڑنا، اس کے لیے جائز نہیں ہے۔ [(1)]

حاشیہ شلبی میں ہے: "قال ابو يوسف فان كان عنده دراهم وليس له مسكن ولا خادم فالحج لازم عليه حتى لو صرفه الى شيء آخر يأثم لوجود الاستطاعة بملك الدراهم في الحال" ترجمہ: امام ابو یوسف علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: کسی بندے کے پاس درہم ہوں اور اس کے پاس گھر اور غلام نہ ہو، تو فی الحال درہموں کا مالک ہونے کی وجہ سے حج کی استطاعت موجود ہونے کے سبب اس پر حج ہی لازم ہے، یہاں تک کہ اگر وہ کسی اور مصرف میں خرچ کرے گا، تو گنہگار ہو گا۔ [(2)]

بہارِ شریعت میں ہے: "اگر اس کے پاس نہ مکان ہے نہ غلام وغیرہ اور روپیہ ہے، جس سے حج کر سکتا ہے، مگر مکان وغیرہ خریدنے کا ارادہ ہے اور خریدنے کے بعد حج کے لائق نہ بچے گا، تو فرض ہے کہ حج کرے اور باتوں میں اُٹھانا گناہ ہے یعنی اس وقت کہ اُس شہر والے حج کو جا رہے

1...(التجرید للقدوری، کتاب الظهار، مسئلة عتق العبد المحتاج للخدمة، جلد10، صفحه5113، مطبوعه قاهره)

2...(حاشیه شلبی مع تبیین الحقائق، کتاب الحج، جلد2، صفحه238، مطبوعه دار الکتب العلمیه، بیروت)

ہوں اور اگر پہلے مکان وغیرہ خریدنے میں اُٹھا دیا، تو حرج نہیں۔“[1]

واللہ اعلم عزوجل و رسولہ اعلم صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

12 جمادی الاولی 1440ھ/19 جنوری 2019ء

فتوی 31:

کرائے پر دیے ہوئے گھر کی وجہ سے حج فرض ہو گا؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ میرے والد صاحب ریٹائر ہوئے، تو انہوں نے گریجویٹی میں ملنے والی رقم سے ایک گھر خریدا، ہمارا اپنا ایک گھر پہلے سے ہے جس میں ہم رہتے ہیں اور دوسرے گھر کو کرائے پر دے دیا، تا کہ ریٹائرمنٹ کی وجہ سے آمدنی میں جو کمی آئی، وہ کسی حد تک پوری ہو سکے، میرے والد صاحب کو پِنشن ملتی ہے، لیکن وہ ہمارے اخراجات کو کافی نہیں ہوتی، اس کے ساتھ مکان کا کرایہ ملتا ہے، تو اخراجات پورے ہوتے ہیں، اس کے علاوہ میرے والد صاحب کے پاس کسی طرح کا کوئی مال موجود نہیں ہے، ایسی صورت میں ان پر کرائے پر دیئے ہوئے مکان کی وجہ سے حج فرض ہو گا؟ ہمارے ایک عزیز نے بتایا ہے کہ کرائے پر دیئے ہوئے گھر کی وجہ سے بھی حج فرض ہو جاتا ہے، کیا ان کی بات درست ہے؟ برائے کرم رہنمائی فرمادیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

بیان کردہ صورت میں آپ کے والد پر حج فرض نہیں ہے کہ حج کے فرض ہونے کے

1...(بہارِ شریعت، جلد1، حصہ6، صفحہ1042، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

لیے ایک شرط یہ ہے کہ وہ شخص حاجت سے زائد اتنے مال کا مالک ہو جو حج کے لیے آنے جانے، وہاں کھانے پینے اور رہائش کے ضروری اخراجات، نیز اتنی مدت کے لیے اس کے اہل و عیال کے نان ونفقہ کے اخراجات کو کافی ہو، اور پوچھی گئی صورت میں آپ کے والد صاحب نے جو گھر کرائے پر دیا ہوا ہے، اس کی آمدن پر آپ لوگوں کا گزر بسر موقوف ہے، اس وجہ سے وہ مکان حاجت سے زائد شمار نہیں کیا جائے گا۔

آپ کے عزیز نے جو مسئلہ بتایا وہ اس صورت میں ہے، جبکہ کرائے پر دیے ہوئے مکان کی آمدن پر گزر بسر موقوف نہ ہو، ایسی صورت میں وہ مکان ضرور حاجت سے زائد شمار ہو گا، اور اگر اس کی قیمت بیان کردہ اخراجات کے لیے کافی ہے، تو حج فرض ہو جائے گا حتی کہ اگر مکان کے بیچنے کے علاوہ حج پر جانے کی کوئی صورت نہ ہو، تو اب اس مکان کو بیچ کر حج پر جانا لازم ہو گا۔

حج کے وجوب کے لیے حاجت سے زائد مال کا ہونا شرط ہے، چنانچہ فتاوی رضویہ میں ہے: ”مال جملہ حاجات سے فاضل آنے جانے کے قابل باتفاق فقہائے کرام شرط وجوب ہے کہ بے اس کے حج واجب ہی نہیں ہوتا۔“[1]

حاجت کی وضاحت کے حوالے سے بہار شریعت میں ہے: ”سفر خرچ کا مالک ہو اور سواری پر قادر ہو۔ سفر خرچ اور سواری پر قادر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ یہ چیزیں اُس کی حاجت سے فاضل ہوں یعنی مکان و لباس و خادم اور سواری کا جانور اور پیشہ کے اوزار اور خانہ داری کے سامان اور دَین سے اتنا زائد ہو کہ سواری پر مکہ معظمہ جائے اور وہاں سے سواری پر واپس آئے اور

---

1 ...(فتاوی رضویہ، جلد 01، صفحہ 699، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

جانے سے واپسی تک عیال کا نفقہ اور مکان کی مرمت کے لیے کافی مال چھوڑ جائے۔"[1]

کرائے پر دی ہوئی ایسی زمینیں جن کی آمدنی پر گزر بسر موقوف ہے، فقہاء نے ایسی زمینوں کی وجہ سے حج کو لازم قرار نہیں دیا جس سے واضح ہوتا ہے کہ اسے حاجت سے زائد شمار نہیں کیا گیا، چنانچہ "النتف فی الفتاوی" (جسے متن کی حیثیت حاصل ہے) میں ہے: "صاحب الضیعة، وتکون قیمة الضیعة مثل الزاد والراحلة أو أکثر إلا أنه یحتاج إلی غلتها أو یحتاج عیاله فلیس علیه الحج۔ ولو أن غلة بعض الضیعة تکفیه وعیاله وقیمة بعض الباقی یکفیه عن الزاد والراحلة فإن علیه أن یحج" زمیندار کہ جس کی زمین کی قیمت حج کے زادِ راہ اور سواری جتنی یا اس سے زائد ہو، لیکن اسے یا اس کے عیال کو اس کی آمدن کی ضرورت ہے، تو اس پر حج لازم نہیں ہے، اور اگر بعض زمین کی آمدنی اسے اور اس کے عیال کو کافی ہے، اور بقیہ زمین کی آمدنی زادِ راہ اور سواری کے لیے کافی ہے، تو اس پر حج لازم ہو گا۔[2]

"بحر العمیق" میں ہے: "وفی القنیة له ارض و عقار و کرم یستغلها او حوانیت یستغلها و یکفیه و عیاله فی السنة غلة بعضها، وفی قیمة بقیة البعض الآخر وفاء بما یحج لزمه الحج" قنیہ میں ہے: کسی کی مِلک میں زمین، عقار (غیر منقولی جائداد)، انگور کے باغ یا دکانیں ہوں، جنہیں اس نے کرائے پر دیا ہوا ہو، اور بعض زمین کی آمدن اس کے اور اس کے عیال کے اخراجات کو کافی ہے، اور بعض دوسری جائداد کی قیمت حج کے اخراجات کے لیے کافی ہے، تو اس پر حج لازم ہے۔[3]

1...(بہار شریعت ملتقطاً، جلد1، حصہ6، صفحہ1039،1040، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

2...(النتف فی الفتاوی، صفحہ131، دار الکتب العلمیہ، بیروت)

3...(البحر العمیق، جلد01، صفحہ385، مؤسسۃ الریان)

خزانۃ المفتیین، فتاوی ہندیہ، تتارخانیہ اور قاضی خان میں ہے، واللفظ لقاضی خان: ”وإن كان صاحب ضيعة إن كان له من الضياع ما لو باع مقدار ما يكفي الزاد والراحلة ذاهبا وجائيا ونفقة عياله، وأولاده ويبقى له من الضيعة قدر ما يعيش بغلة الباقي يفترض عليه الحج، وإلا فلا“ زمیندار جس کی کچھ زمینیں ایسی ہوں کہ جنہیں اگر وہ بیچ دے، تو اس کی قیمت حج کے زادِ راہ، آنے جانے کی سواری اور اس کے عیال و اولاد کے اخراجات کو کافی ہو گی، اور اس کے بعد بھی اس کی کچھ زمین ایسی رہ جائے گی، جس کی آمدنی سے وہ زندگی گزار سکتا ہے، تو اس پر حج فرض ہے، ورنہ نہیں۔[1]

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

15صفر المظفر 1446ھ/21اگست 2024ء

فتوی 32:

انشورنس سے ملنے والی رقم سے حج کرنا کیسا؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ لائف انشورنس سے ملنے والی زائد رقم سے حج کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر حج کر لیا، تو کیا فرض ساقط ہو جائے گا یا دوبارہ کرنا فرض ہو گا؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملك الوهاب اللهم هداية الحق والصواب

لائف انشورنس میں ملنے والی زائد رقم سود ہے، اس لیے کہ انشورنس کمپنی بیمہ

1...(الفتاوی الخانیہ، جلد01، صفحہ250، مطبوعہ کوئٹہ)

ہولڈر سے جن شرائط واصول کے تحت رقم لیتی ہے، اس کی بناء پر اس رقم کی حیثیت فقط قرض کی ہوتی ہے، اس لیے پالیسی لینے والا شخص (قرض خواہ) اورانشورنس کمپنی (قرض دار) کی حیثیت رکھتے ہیں اورچونکہ شرعی اعتبار سے قرض پر معاہدے کے تحت کچھ زائد لینا، اگرچہ مقدار فکس نہ ہو، سود ہوتا ہے، جبکہ کمپنی اپنے پالیسی ہولڈر کواس کی جمع شدہ رقم پر زائد رقم اداکرنے کی پابند ہوتی ہے اوریہ سود ہے اور جو حج سودی رقم سے ادا کیا جائے وہ قبول نہیں ہوتا، کیونکہ اللہ عزوجل پاک ہے اور وہ صرف پاک چیزوں کو ہی قبول کرتا ہے، البتہ اس سے فرض ساقط ہوجاتا ہے، دوبارہ پاک مال سے حج کرنا فرض نہیں ہوتا۔

چنانچہ سود کی تعریف کے بارے میں فقہ کی مشہورکتاب "ہدایہ" میں ہے: "الربا هو الفضل المستحق لأحد المتعاقدين فی المعاوضة الخالی عن عوض شرط فيه" ترجمہ: سودعاقدین میں سے کسی ایک کے لیے معاوضہ میں ثابت ہونے والی وہ مشروط زیادتی ہے جو عوض سے خالی ہو۔[1]

سود کی حرمت کے بارے میں اللہ تعالی قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ ترجمۂ کنزالایمان: "اوراللہ تعالیٰ نے حلال کیابیع کواور حرام کیاسود کو۔"[2]

قرض پر مشروط نفع کے سود ہونے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: "كل قرض جر منفعة فهو ربا، رواه الحارث بن ابی اسامة عن امير المومنين علی كرم الله تعالیٰ وجهه الكريم" ترجمہ: ہروہ قرض جو نفع لے آئے وہ (نفع) سود ہے۔ اسے

1...(ھدایہ اخرین، ج2، ص82، مطبوعہ لاھور)

2...(پارہ3، سورہ بقرہ، آیت 275)

حارث بن ابی اسامہ نے امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجھہ الکریم سے روایت کیا۔[1]

در مختار اور رد المحتار میں ہے: ”کل قرض جر نفعا حرام۔وفی الرد: ای کان مشروطا“ ترجمہ: ہر قرض جو نفع لے آئے وہ حرام ہے، اور رد المحتار میں ہے: یعنی جب وہ نفع مشروط ہو۔[2]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: ” قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: أیھا الناس! إن اللہ طیب لا یقبل إلا طیبا“ ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے لوگو! بیشک اللہ تعالیٰ پاک ہے اور صرف پاک چیزوں کو ہی قبول کرتا ہے۔[3]

اور سودی رقم سے کیے جانے والے حج کے مردود ہونے کے بارے میں حدیث شریف میں ہے: ”جو مالِ حرام لے کر حج کو جاتا ہے جب لبیک کہتا ہے، تو فرشتہ جواب دیتا ہے: ”لا لبیک ولا سعدیک وحجک مردود علیک حتی تردما فی یدیک“ ترجمہ: نہ تیری حاضری قبول، نہ تیری خدمت قبول اور تیرا حج تیرے منہ پر مردود، جب تک تو یہ حرام مال جو تیرے ہاتھوں میں ہے، واپس نہ دے۔[4]

ذمہ سے فرض ساقط ہونے کے بارے میں فتح القدیر میں ہے: ”لا یقبل الحج بالنفقۃ الحرام مع انه یسقط الفرض معھا“ ترجمہ: مال حرام سے کیا گیا حج قبول نہیں کیا جائے گا، باوجود یہ کہ ذمہ سے فرض ساقط ہو جائے گا۔[5]

1...(کنز العمال، کتاب الدین والسلم، رقم الحدیث 15512، ج6، ص99، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

2...(درمختار و ردالمحتار، کتاب البیوع، باب المرابحۃ والتولیۃ، ج7، ص395، دار الکتب العلمیہ، بیروت)

3...(الصحیح لمسلم، کتاب الزکوۃ، ج02، ص703، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

4...(ارشاد الساری لعلی قاری، باب المترقات، ص323، مطبوعہ دار الکتاب العربی، بیروت)

5...(فتح القدیر، کتاب الحج، ج05، ص01، مطبوعہ بیروت، لبنان)

بحر الرائق اور رد المحتار میں ہے: واللفظ للآخر: "لا یقبل بالنفقة الحرام کما ورد فی الحدیث مع انه یسقط الفرض عنه معها ولا تنافی بین سقوطه وعدم قبوله، فلا یثاب لعدم القبول، ولا یعاقب عقاب تارک الحج" ترجمہ: مال حرام سے کیا گیا حج قبول نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ حدیث میں ہے، لیکن مال حرام سے کیے گئے حج کے ساتھ بندے سے فرض ساقط ہو جائے گا اور فرض کے ساقط ہونے اور حج کے قبول نہ ہونے میں کوئی منافات نہیں ہے، حج کے مردود ہونے کی وجہ سے ثواب نہیں ملے گا اور فرض حج ترک کرنے کا گناہ نہیں ملے گا۔[1]

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان علیہ رحمۃ الرحمن لکھتے ہیں: "سود کے روپیہ سے جو کارِ نیک کیا جائے اس میں استحقاق ثواب نہیں..... اس روپے کو اس صَرف میں اٹھانا، جائز نہیں، ہاں فرضِ حج ذمہ سے ادا ہو جائے گا" فان القبول شئی آخر غیر سقوط الفرض و کان کمن صلی فی ارض مغصوبة" ترجمہ: کیونکہ کسی شے کا قبول ہونا اور فرض ساقط ہو جانا دونوں ایک نہیں، بلکہ الگ الگ چیزیں ہیں یعنی قبولیت شے اور چیز ہے اور سقوطِ فرض اور چیز، جیسا کہ کوئی شخص ناجائز مقبوضہ زمین پر نماز پڑھے، تو اگرچہ فرض ساقط ہو جائے گا، مگر نماز مقبول نہ ہو گی۔"[2]

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

الجواب صحیح
مفتی محمد قاسم عطاری

کتبـــــــــــــــہ
المتخصص فی الفقہ الاسلامی
عبدالرب شاکر عطاری مدنی
11 رمضان المبارک 1443ھ 13 اپریل 2022ء

1...(ردالمحتار، کتاب الحج، ج02، ص456، مطبوعہ دارالفکر، بیروت)

2...(فتاوی رضویہ، ج23، ص541، 542، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاهور)

فتوی 33:

والد نے حج نہ کیا ہو، تو بیٹے کے حج کا حکم نیز بیوی کے پیسوں سے شوہر کا حج کرنا کیسا؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں کہ میرے والد صاحب اور میری ملکیت میں اتنا مال نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے ہم پر حج فرض ہو۔ میری زوجہ مالدار ہیں، ان پر حج فرض ہے اور ان کے پاس اتنا مال مزید بھی ہے کہ وہ کسی مَحرم وغیرہ کو اپنے ساتھ حج کے لیے لے جاسکتی ہیں۔ تو میرے سارے اخراجات میری بیوی برداشت کر رہی ہیں اور ہم دونوں حج پر جارہے ہیں۔ کچھ سوالات درپیش ہیں جن کے جوابات عطا فرمادیجیے۔

(1) اگر میں اپنی بیوی کے اخراجات سے حج کروں، تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

(2) میرا یہ حج فرض ادا ہوگا یا نفل؟

(3) بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب تک والد نے حج نہ کیا ہو، تو بیٹے کا حج ادا نہیں ہوتا۔ اس حوالے سے بھی رہنمائی فرمادیں کہ میرے والد صاحب نے حج نہیں کیا ہوا، تو کیا میرا حج ادا ہوجائے گا یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

(1) پوچھی گئی صورت میں آپ کا اپنی بیوی کے خرچے پر حج کرنا بالکل جائز ہے اور بیوی کا یہ خرچ کرنا بھی جائز، بلکہ عورت کے پاس اگر اتنی مالی گنجائش موجود ہو کہ خود اپنا اور اپنے محرم کا خرچ اٹھاسکتی ہے اور کوئی مَحرم یا شوہر اپنے خرچے پر جانے کے لیے تیار نہیں ہے، تو ایسی صورت میں عورت پر لازم ہے کہ وہ اپنا اور اپنے مَحرم کا خرچہ اٹھائے اور فرض حج کی ادائیگی کرے۔

تنویر الابصار اور اس کی شرح درِّ مختار میں ہے: ”و مع زوج او محرم بالغ عاقل غیر مجوسی ولا فاسق مع وجوب النفقۃ لمحرمھا علیھا“ ترجمہ: عورت پر حج کی ادائیگی لازم ہونے کے لیے اس کے ساتھ شوہر یا عاقل بالغ غیر مجوسی، غیر فاسق محرم کا ہونا اور اس محَرم کے اخراجات پر قادر ہونا بھی شرط ہے۔

اس کے تحت فتاوی شامی میں ہے: ”ای فیشترط ان تکون قادرۃ علی نفقتھا ونفقتہ“ ترجمہ: یعنی: یہ شرط ہے کہ عورت اپنے اور محَرم دونوں کے خرچے پر قادر ہو۔[(1)]

علامہ ملّا علی قاری علیہ الرحمۃ لکھتے ہے: ”وفی منسک ابن امیر الحاج: وھل یجب علیھا نفقۃ المحرم والقیام براحلتہ؟ اختلفوا فیہ وصححوا عدم الوجوب وفی السراج الوھاج التوفیق بین قول من یوجب علیھا نفقۃ المحرم وبین قول من لا یوجب ان المحرم اذا قال: لا اخرج الا بالنفقۃ وجب علیھا النفقۃ بالاجماع واذا خرج من غیر اشتراط ذلک لم یجب، انتھی وھو تفصیل حسن“ ترجمہ: منسک ابن امیر الحاج میں ہے کہ کیا عورت پر محرم کا اور اس کی سواری کا بندوبست کرنا واجب ہے؟ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے اور انہوں نے عدمِ وجوب کی تصحیح کی ہے اور سراج الوھاج میں ہے: ان علماء کے قول "جو محرم کے نفقہ کو واجب قرار دیتے ہیں" اور ان علماء کے قول "جو محرم کے نفقہ کو عورت پر واجب قرار نہیں دیتے" اس میں تطبیق یہ ہے کہ جب محرم کہے کہ میں بغیر نفقہ کے نہیں چلوں گا، تو بالاجماع اس عورت پر اس کا نفقہ واجب ہے اور جب بغیر اس شرط کے نکلے تو اس عورت پر نفقہ واجب نہیں ہے۔ (عبارت ختم) یہ اچھی تفصیل ہے۔[(2)]

1...۔(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 3، صفحہ 464، مطبوعہ کوئٹہ)

2...۔(المسلک المتقسط، صفحہ 62، 63، دارالکتب العلمیہ بیروت)

(2) اس بارے میں حکم شرعی یہ ہے کہ ایسا شخص جس پر حج فرض نہ ہو اور وہ فرض حج ،یا مطلق حج کی نیت سے حج کرلے، تو یہ اس کی طرف سے فرض ہی ادا ہو گا، اس صورت میں اگر بعد میں وہ استطاعت والا ہو جاتا ہے، تب بھی اس پر دوبارہ حج فرض نہیں ہو گا اور اگر وہ نفل کی نیت سے حج کرے گا، تو پھر یہ اس کی طرف سے نفلی حج ہو گا اور آئندہ استطاعت ہونے کی صورت میں دوبارہ حج کرنا اس پر فرض ہو جائے گا، **لہٰذا جب آپ کو موقع مل رہا ہے، تو آپ فرض حج کی نیت سے ہی حج ادا کریں، تاکہ فرض ادا ہو جائے۔**

علامہ ملا علی قاری علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: "السادس: الاستطاعۃ وھی شرط الوجوب لا شرط الجواز، والوقوع عن الفرض، حتی لو تکلف الفقیر وحج ونوی حج الفرض او اطلق جاز لہ، وسقط عنہ فرضہ" ترجمہ: چھٹی شرط استطاعت (طاقت) ہے اور یہ وجوب کی شرط ہے، حج کے درست اور حج کے فرض واقع ہونے کی شرط نہیں ہے، یہاں تک کہ اگر فقیر تکلّف کرکے مکے پہنچ جائے اور حج کرلے اور فرض حج کی نیت کرلے یا مطلق نیت کرلے تو اس کا حج درست ہے اور اس کا فرض اس سے ساقط ہو جائے گا۔[1]

مزید اسی میں ہے: "و(اما الفقیر) ای الحقیقی وھو من لیس لہ مال (وبمن معناہ) ای کمن لہ مال لکنہ مستغرق بالدیون (اذا حج سقط عنہ الفرض ان نواہ) ای الفرض فی احرام حجہ (او اطلق النیۃ) ای وان لم یقید بکونہ نفلا او نذرا (حتی لو استغنی) ای صار غنیا بحصول المال من الوجہ الحلال (بعد ذالک) ای بعد ادائہ الحج بغیر استطاعۃ (لا یجب علیہ ثانیا) ای فی المال" ترجمہ: فقیر یعنی حقیقی فقیر وہ کہ جس کے پاس مال نہ ہو اور جو معناً فقیر ہو یعنی جس کے پاس مال تو ہو، لیکن قرض میں مستغرق ہو، جب وہ احرام میں فرض حج کی نیت کرے تو فرض حج ساقط

1...(مناسک ملا علی قاری، صفحہ 44، مطبوعہ بیروت)

ہو جائے گا یا نیت کو مطلق رکھا ہو اور نفل یا نذر کے ساتھ مقید نہ کیا ہو یہاں تک کہ اگر وہ بعد میں مالِ حلال ملنے کی وجہ سے مال دار ہو گیا، تو اس پر دوسری مرتبہ اپنے مال سے حج کرنا واجب نہیں ہو گا۔[1]

بہارِ شریعت میں ہے: "میقات سے باہر کا رہنے والا جب میقات تک پہنچ جائے اور پیدل چل سکتا ہو، تو سواری اُس کے لیے شرط نہیں، لہٰذا اگر فقیر ہو جب بھی اُسے حجِ فرض کی نیت کرنی چاہیے، نفل کی نیت کرے گا، تو اُس پر دوبارہ حج کرنا فرض ہو گا اور مطلق حج کی نیت کی یعنی فرض یا نفل کچھ معین نہ کیا، تو فرض ادا ہو گیا۔"[2]

(3) آپ کے والد صاحب کے حج نہ کرنے کی وجہ سے آپ کے حج پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، بلکہ آپ کا حج درست ادا ہو جائے گا، عوام الناس کا یہ سمجھنا غلط ہے کہ جب تک والد حج نہ کرلے، بیٹے کا حج نہیں ہوتا۔ حج عبادت ہے اور ایک عظیم فریضہ ہے، تو جس طرح دیگر عبادات ایک دوسرے پر موقوف نہیں ہیں، اسی طرح حج بھی کسی دوسرے کے کرنے یا نہ کرنے پر موقوف نہیں ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کا عجیب دستور بنتا جا رہا ہے کہ والد نے حج نہ کیا ہو، تو بیٹا بھی حج کے لیے نہیں جاتا، بلکہ بعض تو حج فرض ہونے کی صورت میں بھی اس وجہ سے نہیں جاتے کہ والدین نے نہیں کیا ہوا اور یوں وہ مسلسل حج کو مؤخر کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ دنیا سے ہی رخصت ہو جاتے ہیں، حالانکہ حج فرض ہونے کے بعد بلا وجہ شرعی اس میں تاخیر کرنا شرعاً ناجائز و گناہ ہے۔

1...(مناسک ملا علی قاری، صفحہ 70، مطبوعہ بیروت)

2...(بہارِ شریعت، جلد 1، صفحہ 1041، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

استطاعت ہونے کے باوجود حج نہ کرنے والے کے بارے میں حدیث پاک میں ارشاد فرمایا ہے: ” من ملک زادا و راحلة تبلغه الی بیت اللہ و لم یحج فلا علیه ان یموت یھودیا او نصرانیا و ذلک ان اللہ یقول فی کتابه ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا﴾ “ترجمہ: جو زاد راہ اور سواری کا مالک ہوا، جو اسے بیت اللہ تک پہنچا دے اور اس نے حج نہ کیا، تو اس کی پرواہ نہیں، چاہے وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا ہے، جو اس تک چل سکے۔[1]

حج فرض ہونے کے بعد تاخیر کرنے والے کے لیے حکم شریعت بیان کرتے ہوئے صدر الشریعہ مفتی محمد امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ”جب حج پر جانے کے لیے قادر ہو، حج فوراً فرض ہو گیا یعنی اسی سال میں اور اب تاخیر گناہ ہے اور چند سالوں تک نہ کیا، تو فاسق ہے اور اس کی گواہی مردود، مگر جب کرے گا ادا ہی ہے، قضا نہیں۔“[2]

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

الجواب صحیح
مفتی محمد قاسم عطاری

کتبـــــــــــــــــــــــــــہ
المتخصص فی الفقہ الاسلامی
ابو حذیفہ محمد شفیق عطاری مدنی
19 شوال المکرم 1443ھ/21 مئی 2022ء

1...(جامع الترمذی، جلد1، صفحہ100، مطبوعہ ملتان)
2...(بہار شریعت، جلد1، حصہ6، صفحہ1036، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ، کراچی)

فتوی 34:

جی پی فنڈ والی رقم کی وجہ سے حج فرض ہوگا یا نہیں؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص کو کمپنی کی طرف سے جی پی فنڈ کی مد میں رقم ملی ہے، جو اُس کی تنخواہ سے ہی کاٹی گئی تھی اور وہ حج کے اخراجات کے برابر ہے، تو کیا اس شخص پر حج فرض ہوگا؟ اصل رقم حج کے اخراجات کے برابر ہو، تو کیا حکم ہے اور سود والی رقم کے ساتھ مل کر حج کے اخراجات کے برابر ہو، تو کیا حکم ہے؟ نیز اگر سود والی رقم کے ساتھ حج کر لیا، تو فرض ادا ہو گیا یا دوبارہ کرنا پڑے گا؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

پوچھی گئی صورت میں اس شخص کو جی پی فنڈ میں ملنے والی اصل رقم (جو اس کی تنخواہ سے ہی کاٹی گئی تھی، وہ رقم) بذاتِ خود یا دیگر مال کے ساتھ مل کر حج کے اخراجات کے برابر ہو، تو دیگر شرائط کے پائے جانے کے ساتھ اس شخص پر حج فرض ہوگا، کیونکہ وہ رقم اس شخص کی اپنی ملک ہے اور حج کے اخراجات کے برابر بندے کی ملکیت میں مال ہونے سے دیگر شرائط پائے جانے سے حج فرض ہوتا ہے۔

اور اگر اس شخص کو جی پی فنڈ میں ملنے والی اصل رقم وغیرہ حج کے اخراجات کے برابر نہ ہو، لیکن زائد ملنے والی سود کی رقم کے ساتھ مل کر حج کے اخراجات کے برابر ہو، تو اس سے حج فرض نہیں ہوگا، کیونکہ مالِ حرام سے حج کرنا حرام ہے، البتہ اگر اس سے حج کر لیا، تو فرض ادا ہو جائے گا، لیکن وہ حج مقبول نہیں ہوگا، نہ ہی ثواب ملے گا، کیونکہ اللہ عزوجل پاکیزہ چیز ہی قبول

فرماتا ہے۔

جامع ترمذی میں حدیث شریف ہے: "لا یقبل اللہ الا الطیب" ترجمہ: اللہ عزوجل صرف پاکیزہ چیز ہی قبول فرماتا ہے۔[1]

الترغیب و الترہیب میں حرام مال کے ساتھ حج کرنے کے متعلق سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث شریف مروی ہے: "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم: ۔۔۔اذا خرج بالنفقة الخبیثة فوضع رجله فی الغرز فنادیٰ: لبیک، ناداہ منادٍ من السماء لا لبیک و لا سعدیک زادُک حرام و نفقتک حرام و حجک مأزور غیر مبرور" ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے ارشاد فرمایا: ۔۔۔ بندہ جب حرام مال کے ساتھ حج کرنے کے لیے نکلتا ہے اور رکاب میں پاؤں رکھتا ہے، تو پکارتا ہے: "لبیک (یعنی یا اللہ عزوجل میں حاضر ہوں)" تو آسمان سے ندا آتی ہے: "لا لبیک و لا سعدیک (یعنی نہ تیری حاضری قبول ہے نہ تیری خدمت۔)" تیرا زادِ راہ اور تیرا نفقہ حرام ہے اور تیرا حج لوٹایا ہوا اور نامقبول ہے۔[2]

زادِ راہ پر قادر ہونے پر حج فرض ہونے کے متعلق ہدایہ میں ہے: "الحج واجب علی الاحرار البالغین العقلاء الاصحاء اذا قدروا علی الزاد و الراحلة" ترجمہ: آزاد، بالغ، عاقل، تندرست لوگ جب زادِ راہ اور سواری پر قادر ہوں، تو ان پر حج فرض ہے۔[3]

حرام مال کے ساتھ حج کرنے کے متعلق در مختار میں ہے: "وقد یتصف بالحرمة کالحج بمال حرام" ترجمہ: اور حج کرنا کبھی حرام ہوتا ہے جیسا کہ مالِ حرام سے حج کرنا۔

اس کے تحت رد المحتار میں ہے: "ان الحج نفسه الذی ھو زیارۃ مکان مخصوص الخ

1۔۔۔(جامع الترمذی، ابواب الزکوۃ، باب ماجاء فی فضل الصدقة، جلد 1، صفحہ 260، مطبوعہ لاھور)

2۔۔۔(الترغیب والترھیب، الترغیب فی النفقة فی الحج والعمرۃ، جلد 2، صفحہ 113، دار الکتب العلمیہ، بیروت)

3۔۔۔(الھدایة، کتاب الحج، جلد 1، صفحہ 145، مطوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

لیس حراما بل الحرام ھو انفاق المال الحرام۔۔۔قال فی البحر و یجتھد فی تحصیل نفقۃ حلال فانہ لا یقبل بالنفقۃ الحرام کما ورد فی الحدیث مع انہ یسقط الفرض عنہ معھا "ترجمہ: حج جو مخصوص جگہوں کی زیارت کا نام ہے، وہ فی نفسہ حرام نہیں ہے، بلکہ مالِ حرام خرچ کرنا حرام ہے ۔۔۔ بحر میں کہا ہے: حلال نفقہ حاصل کرنے کی کوشش کرے، کیونکہ حرام نفقہ کے ساتھ حج قبول نہیں ہوتا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے اگرچہ حرام نفقہ کے ساتھ بندے سے فرض ساقط ہو جاتا ہے۔[1]

سیدی اعلیٰ حضرت امام اہلسنت مولانا الشاہ امام احمد رضا خان علیہ رحمۃ الرحمٰن فتاویٰ رضویہ میں مالِ حرام کے ہوتے ہوئے حج فرض ہونے کے متعلق فرماتے ہیں: "اگر اس کے پاس مالِ حلال کبھی اتنا نہ ہوا، جس سے حج کر سکے اگرچہ رشوت کے ہزارہا روپے ہوئے، تو اس پر حج فرض ہی نہ ہوا کہ مالِ رشوت مالِ مغصوب ہے، وہ اس کا مالک ہی نہیں اور اگر مالِ حلال اس قدر اس کے پاس ہے یا کسی موسم میں ہوا تھا، تو اس پر حج فرض ہے، مگر رشوت وغیرہ حرام مال کا اس میں صرف کرنا حرام ہے اور وہ حج قابلِ قبول نہ ہو گا اگرچہ فرض ساقط ہو جائے گا۔"[2]

واللہ اعلم عزوجل و رسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

23 رجب المرجب 1439ھ/10 اپریل 2018ء

1...(ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الحج، مطلب فیمن حج بمال حرام، جلد3، صفحہ519، مطبوعہ کوئٹہ)

2...(فتاویٰ رضویہ، جلد10، صفحہ708، رضا فاؤنڈیشن، لاھور)

فتوی 35:

گورنمنٹ حج اسکیم میں نام نہ آنے کی وجہ سے حج مؤخر کرنا کیسا؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے حج کے سلسلے میں گورنمنٹ فارم حاصل کیا اور مقررہ وقت پر رقم بھی جمع کروادی، مگر اس کا نام نہیں نکلا، ابھی چونکہ پرائیویٹ کاروان کے ذریعے درخواستیں جمع ہورہی ہیں اور جانا، ممکن بھی ہے، تو کیا اس شخص پر لازم ہے کہ پرائیویٹ ذریعہ اختیار کرتے ہوئے حج پر جائے اور اگر نہ جائے اور آئندہ سال کوشش کر کے گورنمنٹ کے تحت سفر کرلے، تو کیا گنہگار ہوگا؟ کیونکہ گورنمنٹ اور پرائیویٹ کے ریٹ میں لاکھوں کا فرق آرہا ہے اور یہ خرچ کرنے کی بھی استطاعت موجود ہے، لیکن اگر کم پیسوں میں ہو جائے، تو فبہا اور اگر تاخیر کے سبب گناہ کا معاملہ آئے گا، تو پرائیویٹ ہی انتظام کرلیں گے۔ اس بارے میں آپ شرعی رہنمائی فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق والصواب

صورت مسئولہ میں اس شخص کے پاس جب اتنی استطاعت موجود ہے کہ اپنے گھر، اہل وعیال یعنی جن کا نفقہ اس کے ذمے لازم ہے، وہ نکالنے کے بعد اتنی رقم موجود ہے کہ پرائیویٹ ذریعہ اختیار کرتے ہوئے حج کے اخراجات کو کافی ہے، تو اس پر فرض ہے کہ اسی سال حج پر جائے اور آئندہ سال تک تاخیر نہ کرے کہ حج فرض ہونے کے بعد بلاوجہ شرعی تاخیر کرنا گناہ ہے اور حدیث پاک میں ایسے شخص کے بارے میں سخت وعید موجود ہے۔

چنانچہ امام ابو عیسی الترمذی رحمہ اللہ تعالی ایک حدیث پاک نقل فرماتے ہیں: "من ملک زادا وراحلۃ تبلغہ الی بیت اللہ ولم یحج فلا علیہ ان یموت یھودیا او نصرانیا وذلک ان اللہ

یقول فی کتابہ ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ یعنی جو زاد راہ اور سواری کا مالک ہوا، جو اسے بیت اللہ تک پہنچا دے اور اس نے حج نہ کیا، تو اس کی پرواہ نہیں، چاہے وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا ہے، جو اس تک چل سکے۔[1]

صدر الشریعہ مفتی محمد امجد علی اعظمی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حج فرض ہونے کی شرائط کو لکھتے ہوئے فرماتے ہیں: "(ساتویں شرط) سفر خرچ کا مالک ہو اور سواری پر قادر ہو، خواہ سواری اس کی ملک ہو یا اس کے پاس اتنا مال ہو کہ کرایہ پر لے سکے۔" مزید لکھتے ہیں: "سفر خرچ اور سواری پر قادر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ یہ چیزیں اُس کی حاجت سے فاضل ہوں یعنی مکان و لباس و خادم اور سواری کا جانور اور پیشہ کے اوزار اور خانہ داری کے سامان اور دَین سے اتنا زائد ہو کہ سواری پر مکہ معظمہ جائے اور وہاں سے سواری پر واپس آئے اور جانے سے واپسی تک عیال کا نفقہ اور مکان کی مرمت کے لیے کافی مال چھوڑ جائے اور جانے آنے میں اپنے نفقہ اور گھر اہل وعیال کے نفقہ میں قدرِ متوسط کا اعتبار ہے۔ نہ کمی ہو نہ اِسراف۔ عیال سے مراد وہ لوگ ہیں، جن کا نفقہ اُس پر واجب ہے، یہ ضروری نہیں کہ آنے کے بعد بھی وہاں اور یہاں کے خرچ کے بعد کچھ باقی بچے۔"[2]

اور حج فرض ہونے کے بعد تاخیر کرنے والے کے لیے حکم شریعت بیان کرتے ہوئے صدر الشریعہ علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: "جب حج پر جانے کے لیے قادر ہو، حج فوراً فرض ہو گیا یعنی اسی سال میں اور اب تاخیر گناہ ہے اور چند سالوں تک نہ کیا، تو فاسق ہے اور اس کی گواہی مردود، مگر

1...(جامع الترمذی، جلد1، صفحہ100، مطبوعہ ملتان)

2...(بہار شریعت، جلد1، حصہ6، صفحہ1039، 1040، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ، کراچی)

جب کرے گا ادا ہی ہے، قضا نہیں۔"[1]

و اللہ اعلم عزوجل و رسولہ اعلم صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم

الجواب صحیح
مفتی محمد قاسم عطاری

کتبـــــــــــــــہ
المتخصص فی الفقہ الاسلامی
ابو حذیفہ محمد شفیق عطاری مدنی
03 شعبان المعظم 1435ھ/02 جون 2014ء

فتوی 36:

آفاقی (میقات سے باہر رہنے والا) حج افراد کر سکتا ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین اِس مسئلے کے بارے میں کہ میں اصلاً پاکستانی ہوں، مگر بہت عرصہ سے ایک کمپنی میں بطورِ ملازم، مدینہ منورہ مقیم ہوں اور میرا اِس سال حجِ اِفراد کا ارادہ ہے، میرے ساتھ رہنے والے دو افراد کا کہنا ہے کہ میقات کے باہر سے آنے والے حجِ افراد نہیں کر سکتے، بلکہ وہ صرف حجِ قِران یا تمتع ہی کر سکتے ہیں۔ کیا اُن کی کہی بات درست ہے؟ اِس حوالے سے ہمیں شرعی رہنمائی عطا فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

آفاقی یعنی میقات سے باہر رہنے والے کے لیے حجِ قِران یا تمتع کی طرح حجِ اِفراد کرنا بھی جائز ہے، ہاں حجِ قِران افضل ہے، چنانچہ ابو منصور امام محمد بن مکرم کرمانی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات: 597ھ/1200ء) لکھتے ہیں: "الحج المفرد یتحقق من الآفاقی و غیر الآفاقی" ترجمہ: حجِ اِفراد آفاقی اور غیر آفاقی دونوں سے متحقق ہو سکتا ہے۔ (یعنی دونوں طرح کے اَفراد ہی حجِ اِفراد کر سکتے

---

1 ...(بہارِ شریعت، جلد 1، حصہ 6، صفحہ 1036، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ، کراچی)

ہیں۔)[1]

نور الدین علامہ علی قاری حنفی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات:1014ھ/1605ء) لکھتے ہیں:"الافراد لمطلق الناس من الآفاقی والمکی" ترجمہ: حجِ اِفراد آفاقی و مکی سب کے لیے جائز ہے۔[2]

البتہ آفاقی کے لیے دیگر دو اَقسامِ حج کی بنسبت "حجِ قِران" افضل ہے، پھر تمتع ہے، پھر اِفراد۔ چنانچہ علامہ ابو المَعالی بخاری حنفی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات:616ھ/1219ء) لکھتے ہیں:"أن القران في حق الآفاقي أفضل من التمتع والإفراد" ترجمہ: آفاقی کے حق میں تمتع اور اِفراد کی بنسبت حجِ قِران زیادہ فضیلت والا ہے۔[3]

واللہ اعلم عزوجل **ورسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبــــــــــــــــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

04ذو الحجۃ الحرام1443ھ/04جولائی2022ء

فتوی37:

نفلی حج افضل ہے یا نفلی صدقہ؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنا فرض حج ادا کر لیا ہے، اب وہ نفل حج کرنا چاہتا ہے، تو کیا نفلی حج کرنا افضل ہے یا کسی حاجت مند کی حاجت روائی کرنا افضل ہے؟

1...(المسالک فی المناسک، جلد1، صفحہ371، مطبوعہ دار البشائر الاسلامیہ، بیروت)
2...(المسلک المتقسط شرح المنسک المتوسط، صفحہ134، مطبوعہ المکتبۃ الامدادیۃ، مکۃ المکرمۃ)
3...(المحیط البرھانی، کتاب المناسک، جلد2، صفحہ465، مطبوعہ دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملك الوهاب اللهم هداية الحق والصواب

نفلی کاموں میں سے کونسا نفلی کام افضل ہے، اس بارے میں فقہائے اسلام نے قاعدہ بیان کیاہے کہ جس نفلی کام کی حاجت وضرورت زیادہ ہووہ افضل ہے، لہذا اگر کسی علاقے میں مسافرخانے یا پُل وغیرہ کی زیادہ حاجت ہو، تو یہ بنانا نفلی حج سے افضل ہے، جبکہ نفلی حج، عام صدقات سے افضل ہے، البتہ اگر کوئی شخص بہت حاجت مند اور تکلیف میں ہے یا نیک لوگوں میں سے کوئی ضرورت مند ہے یا ساداتِ کرام میں سے کوئی محتاج ہے، تو اس کی مدد کرنا نفلی حج سے افضل ہے۔

جیسا کہ ردالمحتار میں ہے: ”قال الرحمتی: والحق التفصیل، فما کانت الحاجة فيه أكثر والمنفعة فيه أشمل فهو الأفضل كما ورد حجة أفضل من عشر غزوات وورد عكسه فيحمل على ما كان أنفع، فاذا كان أشجع وأنفع فى الحرب فجهاده أفضل من حجه أو بالعكس فحجه أفضل وكذا بناء الرباط ا ن كان محتاجا ليه كان أفضل من الصدقة وحج النفل واذا كان الفقير مضطرا أو من أهل الصلاح أو من آل بيت النبى صلى الله عليه وسلم فقد يكون اكرامه أفضل من حجات وعمر وبناء ربط“ ترجمہ: علامہ رحمتی نے فرمایا: حق یہ ہے کہ اس مسئلہ میں تفصیل ہے: وہ یہ کہ جس کی حاجت زیادہ ہو اور نفع زیادہ ہو، تو وہ افضل ہے، جیسا کہ روایت میں ہے کہ ایک حج دس غزوات سے افضل ہے اور اس کا عکس بھی مروی ہے، اسی طرح اگر مسافر خانہ کی حاجت ہو، تو مسافر خانہ بنانا صدقہ اور نفلی حج کرنے سے افضل ہے اور جب فقیر مجبور ہو یا نیک لوگوں میں سے ہو یا حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم کے اہل بیت میں سے ہو، تو اس کی عزت افزائی نفلی حج وعمرہ اور مسافر خانہ بنانے

سے افضل ہے۔[1]

صدرالشریعہ مفتی محمد امجد علی اعظمی علیہ رحمۃ اللہ القوی لکھتے ہیں: "مسافر خانہ بنانا، حج نفل سے افضل ہے اور حج نفل صدقہ سے افضل یعنی جبکہ اس کی زیادہ حاجت نہ ہو، ورنہ حاجت کے وقت صدقہ حج سے افضل ہے۔ علامہ شامی نے نہایت نفیس حکایت اس بیان میں نقل فرمائی کہ ایک صاحب ہزار اشرفیاں لے کر حج کو جارہے تھے، ایک سیّدانی تشریف لائی اوراپنی ضرورت ظاہر فرمائی، تو انہوں نے سب اشرفیاں نذر کر دیں اور واپس آئے، جب وہاں کے لوگ حج سے واپس ہوئے، تو ہر حاجی ان سے کہنے لگا، اللہ (عزوجل) تمہارا حج قبول فرمائے، انہیں تعجب ہوا کہ کیا معاملہ ہے، میں تو حج کو گیا نہیں، یہ لوگ ایسا کیوں کہتے ہیں؟ خواب میں زیارتِ اقدس (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) سے مشرف ہوئے، ارشاد فرمایا: کیا تجھے لوگوں کی بات سے تعجب ہوا؟ عرض کی، ہاں یارسول اللہ! (عزوجل و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) فرمایا کہ تونے جو میری اہلبیت کی خدمت کی، اس کے عوض میں اللہ عزوجل نے تیری صورت کا ایک فرشتہ پیدا فرمایا، جس نے تیری طرف سے حج کیا اور قیامت تک حج کرتا رہے گا۔"[2]

واللہ اعلم عزوجل **و رسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

الجواب صحیح
مفتی محمد قاسم عطاری

کتبــــــــــــــــــــــہ
المتخصص فی الفقہ الاسلامی
عبدالرب شاکر قادری عطاری
16 جمادی الثانی 1442ھ/30 جنوری 2021ء

1...(ردالمحتار مع الدرالمختار، کتاب الحج، مطلب فی تفضیل الحج علی الصدقۃ، جلد4، صفحہ55، مطبوعہ کوئٹہ)
2...(بہار شریعت، جلد1، صفحہ1216، 1217، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

حج بدل

فتویٰ 38:

حج بدل کے لیے کس کو بھیجا جائے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں کہ کیا حج بدل کرنے والا اپنے فریضہ حج کی ادائیگی سے بری الذمہ ہو جاتا ہے؟ مثلاً ایک شخص پر حج فرض ہے کوئی دوسرا شخص حج بدل کروانا چاہتا ہے، تو اب اس پر دوبارہ حج کرنا فرض رہے گا یا نہیں؟ اور جس پر حج فرض نہ ہو، اس کو بھیجنا کیسا ہے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

جس شخص پر حج فرض ہو، اسے کسی اور کی طرف سے حج بدل کرنا، یونہی جانتے ہوئے دوسرے کا اسے حج بدل کے لئے بھیجنا مکروہ تحریمی وناجائز ہے، کیونکہ اس پر تو فرض ہے کہ اپنا حج ادا کرے اور ایسا شخص اگر حج بدل کے طور پر چلا بھی جائے، تو حج بدل کرنے کی وجہ سے اپنا حج ساقط نہیں ہو گا، وہ بدستور اس پر فرض ہی رہے گا اور جو شخص حج بدل کروا رہا ہو، اسے چاہیے کہ اس شخص سے معلوم کرلے کہ اس پر حج کا فریضہ پہلے سے ہی لازم ہے یا نہیں؟ اور لازم ہونے کی صورت میں اسے بالکل بھی نہ بھیجے اور جس پر حج فرض نہ ہوا ہو، اس کو بھیجنا جائز ہے اور بہتر یہ ہے کہ حج بدل کے لیے ایسے شخص کو بھیجا جائے، جو پہلے فرض حج ادا کر چکا ہو۔

حج بدل کے لئے کس کو بھیجا جائے، اس کے بارے میں نقایہ اور اس کی شرح فتح العنایہ میں ہے: "ومن عجز فاحج غیرہ سواء کان ذلک الغیر ذکرا او انثی حرا او عبدا

ماذونا، حج عن نفسه اولم يحج صح لكن يكره احجاج الانثى حرة او امة عن الذكر وكذا العبد كراهة تنزيهة واما من لم يحج عن نفسه فمكروه كراهة تحريم" یعنی جو شخص حج کرنے سے عاجز ہو اور اس نے اپنی جگہ کسی اور کو حج کروایا، چاہے وہ حج کرنے والا آزاد مرد ہو یا عورت یا پھر عبد ماذون ہو، اس نے اپنی طرف سے حج کیا ہو یا نہ کیا ہو، ان تمام صورتوں میں حج کروانے والے کا حج درست ہو جائے گا، لیکن آزاد مرد کی بنسبت آزاد یا غلام عورت یا غلام کو حج کے لیے بھیجنا مکروہ تنزیہی ہے اور اگر کسی نے حج فرض ہونے کے باوجود خود اپنی طرف سے حج نہیں کیا، تو ایسے شخص کو حج کے لیے بھیجنا مکروہ تحریمی ہے۔[1]

صدر الشریعہ بدر الطریقہ حضرت علامہ مولانا مفتی امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں: "جس پر حج فرض ہے اور نہ ادا کیا نہ وصیت کی، تو بالاجماع گنہگار ہے۔ اگر وارث اُس کی طرف سے حج بدل کرانا چاہے، تو کرا سکتا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ امید ہے کہ ادا ہو جائے اور اگر وصیت کر گیا، تو تہائی مال سے کرایا جائے اگرچہ اُس نے وصیت میں تہائی کی قید نہ لگائی ہو۔ مثلاً یہ کہہ کر مرا کہ میری طرف سے حج بدل کرایا جائے۔"[2]

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں: "بہتر یہ ہے کہ حج بدل کے لئے ایسا شخص بھیجا جائے، جو خود حجۃ الاسلام (حجِ فرض) ادا کر چکا ہو اور اگر ایسے کو بھیجا، جس نے خود نہیں کیا ہے، جب بھی حجِ بدل ہو جائے گا اور اگر خود اس پر حج فرض ہو اور ادا نہ کیا ہو، تو اسے بھیجنا مکروہ تحریمی ہے۔"[3]

1...(فتح باب العنایہ شرح نقایہ، جلد1، صفحہ731، مطبوعہ کراچی)
2...(بہار شریعت، جلد1، حصہ6، صفحہ1206، مکتبۃ المدینہ، کراچی)
3...(بہار شریعت، جلد1، حصہ6، صفحہ1203، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

واللہ اعلم عزوجل و رسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

الجواب صحیح
مفتی محمد قاسم عطاری

کتبـــــــــــــــــــہ
المتخصص فی الفقہ الاسلامی
ابو حذیفہ محمد شفیق عطاری مدنی
01 رجب المرجب 1437ھ/09 اپریل 2016ء

فتوی 39:

جس نے حج نہ کیا اسے حج بدل کے لیے بھیجنا، نیز حج بدل والا نیت کیا کرے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین درج ذیل سوالات کے بارے میں:

(1) جس شخص نے اپنا حج نہیں کیا اور اس پر حج فرض بھی نہیں، تو کیا اسے حجِ بدل کے لیے بھیج سکتے ہیں؟

(2) حجِ بدل کرنے والا کس کی طرف سے حج کی نیت کرے گا، اپنی طرف سے یا حج کروانے والے کی طرف سے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

(1) شرائط کی موجودگی میں کسی دوسرے سے حج بدل کرواسکتے ہیں، لیکن بہتر یہ ہے کہ حج بدل کے لیے ایسے شخص کو بھیجا جائے، جو متقی و پرہیز گار، حج کے مسائل کو جانتا ہو اور اپنی طرف سے حج ادا کر چکا ہو، تاکہ ارکانِ حج کامل طریقے سے ادا کر سکے اور اگر اس نے پہلے حج نہیں کیا اور اس پر حج فرض بھی نہیں، تو اسے بھیجنا بھی جائز ہے اور حج بھی ادا ہو جائے گا، البتہ جس شخص پر حج فرض ہو چکا ہو اور اس نے ابھی تک ادا نہ کیا ہو، تو جان بوجھ کر اسے حجِ بدل کے لیے بھیجنا مکروہِ تحریمی ہے۔

شرائط کی موجودگی میں دوسرے سے حج کرواسکتے ہیں۔ چنانچہ فتاوی عالمگیری میں ہے:" العبادات ثلاثةانواع: مالية محضة كالزكاة وصدقة الفطر, وبدنية محضة كالصلاة والصوم، ومركبة منهما كالحج. والانابة تجرى فى النوع الاول فى حالتي الاختيار والاضطرار، ولا تجرى فى النوع الثانى، وتجرى فى النوع الثالث عند العجز"عبادات کی تین قسمیں ہیں: **فقط مالی:** جیسے زکاۃ اور صدقہ فطر۔ **فقط بدنی:** جیسے نماز اور روزہ۔ **مالی اور بدنی کا مجموعہ:** جیسے حج۔ پہلی قسم میں اختیاری اور اضطراری دونوں حالتوں میں (اپنی طرف سے دوسرے کو) نائب بنانا صحیح ہے، اور دوسری قسم میں مطلقاً درست نہیں اور تیسری میں خود قادر نہ ہونے کے وقت نائب بناسکتے ہیں۔[1]

حجِ بدل کے لیے کس شخص کو بھیجنا بہتر ہے، اس بارے میں الاختیار لتعلیل المختار میں ہے:"والاولى ان يختار رجلا حرا عاقلا بالغا قد حج، عالما بطريق الحج وافعاله، ليقع حجه على اكمل الوجوه"ترجمہ: بہتر یہ ہے کہ حج کے لیے ایسے شخص کا انتخاب کرے جو آزاد، عاقل بالغ اور اس نے پہلے حج کر لیا ہو، اور حج کے راستے اور اس کے افعال کو جانتا ہو، تاکہ کامل طریقے سے اس کا حج ادا ہو جائے۔[2]

اور اس مسئلے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے صدر الشریعہ مفتی محمد امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں:"بہتر یہ ہے کہ حج بدل کے لیے ایسا شخص بھیجا جائے، جو خود حجۃ الاسلام ادا کر چکا ہو اور اگر ایسے کو بھیجا، جس نے خود نہیں کیا ہے، جب بھی حجِ بدل ہو جائے گا، اور اگر خود اس پر حج فرض ہو اور ادا نہ کیا ہو، تو اسے بھیجنا مکروہِ تحریمی ہے۔[3]

1...(فتاوی عالمگیری، ج1، ص283، مطبوعہ کراچی)
2...(الاختیار لتعلیل المختار، ج1، ص171، دار الکتب العلمیہ، بیروت)
3...(بہار شریعت، ج1، ص1203، 1204، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

اور مفتی وقار الدین رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں: ”حج بدل میں ایسے شخص کو بھیجنا چاہئے، جو متقی، پرہیز گار اور حج کے مسائل جاننے والا ہو، اگر پہلے حج کر چکا ہے تو زیادہ اچھا ہے، اور اگر پہلے حج نہیں کیا جب بھی بھیجنا جائز ہے۔“[1]

(2) حجِ بدل کرنے والے کے لیے محجوج عنہ (یعنی جس کی طرف سے حج کر رہا ہے، اس) کی طرف سے حج کی نیت کرنا ضروری ہے، اپنی طرف سے حج کی نیت نہیں کر سکتا، اگر اپنی طرف سے کرے گا، تو حج کروانے والے کا حج ادا نہیں ہو گا۔

مناسک ملا علی قاری میں حجِ بدل کی شرائط کے بیان میں ہے: ”(التاسع النية) ای نية المحجوج عنه عند الاحرام اوبعده عند الامام قبل ان يشرع فی افعال الحج (وهی ان يقول) ای بلسانه وهو افضل (احرمت عن فلان) ای نويت الحج عن فلان۔۔۔ (وان شاء اكتفی) ای عنه (بنية القلب) ای له“ ترجمہ: نویں شرط نیت ہے، یعنی احرام کے وقت محجوج عنہ (جس کی طرف سے حج کر رہا ہے، اس) کی طرف سے نیت ہو۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک احرام کے بعد اور حج کے افعال شروع کرنے سے پہلے بھی نیت ہو سکتی ہے اور نیت یہ ہے کہ بندہ زبان سے یوں کہے (زبان سے نیت کرنا افضل ہے) کہ میں نے فلاں کی طرف سے احرام باندھا، یعنی میں نے فلاں کی طرف سے حج کی نیت کی اور اگر چاہے، تو اس کی طرف سے دل کی نیت پر اکتفا کر لے۔[2]

اور بدائع الصنائع میں حجِ بدل کی شرائط کے بیان میں ہے: ”منها: نية المحجوج عنه عند

1...(وقار الفتاوی، ج2، ص467، مطبوعہ بزم وقار الدین، کراچی)

2...(مناسک ملا علی قاری، ص442، مطبوعہ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی)

الاحرام،لان النائب یحج عنه،لاعن نفسه،فلابد من نیته" ترجمہ:حجِ بدل کی شرائط میں سے یہ ہے کہ احرام کے وقت محجوج عنہ (جس کی طرف سے حج کر رہا ہے،اس)کی طرف سے نیت ہو،کیونکہ نائب (حج کرنے والا) حج کروانے والے کی طرف سے حج کر رہا ہے،نہ کہ اپنی طرف سے،لہذا اسی کی طرف سے نیت کرنا ضروری ہے۔[1]

اوراعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ حج بدل کی شرائط کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:"حجِ بدل کرنے والا تنہا ایک محجوج عنہ کی طرف سے حجِ واحد کی نیت کرے،مثلا:"احرمت عن فلان یااللھم لبیک عن فلان" اگر اس کی طرف سے نیت نہ کی یا دو حج کی نیت کی،ایک اس کی طرف سے،ایک اپنی طرف سے یا دو شخصوں کی طرف سے نیت کی،ایک اس کی جانب،ایک منیب آخر کی جانب سے،تو کافی نہ ہو گا۔"[2]

نوٹ:حجِ بدل کی شرائط اور ان کے مختلف احکام جاننے کے لیے بہارِ شریعت،ج1، حصہ6،ص1201سے حجِ بدل کی شرائط کا مطالعہ فرمائیں۔رفیق الحرمین ص208تا212پر بھی ان کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبــــــــــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

29شوال المکرم1443ھ31مئی2022ء

1...۔(بدائع الصنائع،ج2،ص456،مطبوعہ کوئٹہ)

2...۔(فتاوی رضویہ،ج10،ص660،مطبوعہ رضافاؤنڈیشن،لاھور)

فتوی 40:

مرحوم کی وصیت کے بغیر اس کی طرف سے حج بدل کروانا کیسا؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں کہ ہمارے والد صاحب پر حج فرض تھا، لیکن انہوں نے حج نہیں کیا اور فوت ہو گئے اور حج کے لیے وصیت بھی نہیں کی۔ اب کیا ورثا ان کی طرف سے حجِ بدل کر سکتے ہیں یا کسی کے ذریعے کروا سکتے ہیں؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق والصواب

پوچھی گئی صورت میں والد صاحب کے فرض حج کے بدلے میں ان کی طرف سے کسی وارث کا حجِ بدل کرنا یا ورثا کا کسی اور شخص کو حجِ بدل کے لیے بھیجنا، جائز اور عظیم اجر وثواب کا کام ہے، لہٰذا ورثا کو یہ نیکی ضرور کرنی چاہیے، اگرچہ والد صاحب نے حجِ بدل کی وصیت نہیں کی تھی، لیکن اللہ پاک کی رحمت سے امید ہے کہ وہ حج ان کے فرض حج کا بدل ہو جائے اور ان کی طرف سے فرض حج ادا ہو جائے۔

بہتر یہ ہے کہ حجِ بدل کرنے والا شخص متقی و پرہیز گار ہو، حج کے مسائل جانتا ہو اور اپنی طرف سے حج ادا کر چکا ہو، تاکہ ارکانِ حج مکمل اور درست طریقے سے ادا کر سکے، لیکن ایسے شخص کو بھیجنا بھی جائز ہے، جس نے پہلے حج نہ کیا ہو اور اس پر حج بھی فرض نہ ہو۔ البتہ جس شخص پر حج فرض ہو چکا ہو اور اس نے ابھی تک ادا نہ کیا ہو، تو جان بوجھ کر اسے حجِ بدل کے لیے بھیجنا مکروہِ تحریمی اور گناہ ہے۔

فتاوی عالمگیری میں حجِ بدل کی شرائط سے متعلق ہے: ”منھا: الامر بالحج، فلا یجوز حج الغیر عنہ بغیر امرہ، الا الوارث یحج عن مورثہ بغیر امرہ، فانہ یجزیہ“ ترجمہ: حجِ بدل کی شرائط

میں سے ایک یہ ہے کہ (جس کی طرف سے کیا جائے، اُس نے) حج کا حکم دیا ہو، لہٰذا اس کے حکم کے بغیر اس کی طرف سے کسی دوسرے کا حج کرنا، درست نہیں ہو گا، سوائے اِس کے کہ وارث اپنے مورِث (مرحوم) کی طرف سے اس کے حکم کے بغیر کرلے، تو ادا ہو جائے گا۔(1)

اسی میں دوسری جگہ ہے: "مَن علیه الحج اذا مات قبل ادائه، فان مات عن غیر وصیة یأثم بلا خلاف، وان احب الوارث ان یحج عنه حج وارجوان یجزئه ذلک ان شاء اللّٰہ تعالیٰ، کذا ذکر اَبو حَنیفةَ رَحِمَہُ اللّٰہُ تعالی "ترجمہ: جس پر حج فرض ہو اور ادا کرنے سے پہلے فوت ہو جائے، اگر (حج کی) وصیت کیے بغیر مرا، تو وہ بالاتفاق گنہگار ہے۔ اگر وارث اُس کی طرف سے حجِ بدل کرانا چاہے، تو کرا سکتا ہے اور امید ہے کہ ان شاء اللہ الکریم اس کی طرف سے ادا ہو جائے، اِسی طرح امامِ اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔(2)

حجِ بدل کے لیے کس شخص کو بھیجنا بہتر ہے، اس بارے میں الاختیار لتعلیل المختار میں ہے: "والاولی ان یختار رجلا حرا عاقلا بالغا قد حج، عالما بطریق الحج وافعاله، لیقع حجه علی اکمل الوجوہ "ترجمہ: اور بہتر یہ ہے کہ حج کے لیے ایسے شخص کا انتخاب کرے، جو آزاد، عاقل، بالغ ہو، پہلے حج کر چکا ہو اور حج کے راستے اور اُس کے افعال (کاموں) کو جانتا ہو، تاکہ اس کا حج کامل طریقے سے ادا ہو جائے۔(3)

امامِ اہلِسنت، سیدی اعلیٰ حضرت الشاہ امام احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں: "اگر حضرت کی والدہ ماجدہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہا پر۔۔۔۔ اُس سال سے پہلے (حج) فرض ہو

1...(الفتاوی العالمگیریة، ج1، ص283، مطبوعہ کراچی)

2...(الفتاوی العالمگیریة، ج1، ص285، مطبوعہ کراچی)

3...(الاختیار لتعلیل المختار، ج1، ص220، مطبوعہ کراچی)

چکا تھا، تو البتہ حجِ فرض ان پر باقی رہا۔ حضرت ان کی طرف سے ادا فرمائیں یا ادا کرا دیں، تو اجرِ عظیم ہے۔۔۔ حج بدل یعنی نیابۃً دوسرے کی طرف سے حج فرض ادا کرنا کہ اُس پر سے اِسقاطِ فرض کرے، اِن شرائط سے مشروط ہے:۔۔۔ یہ حج بأَمرِ محجوج عنہ ہو۔ بلا اجازت دوسرے کی طرف سے حج کافی نہ ہو گا، مگر جبکہ وارث اپنے مورث (مرحوم) کی طرف سے حج کرے یا کرائے، لقیامہ مقامَہ خِلافۃ۔ ملخصا"[1]

اِس سوال کہ "ایک خوشحال شخص اپنی متوفیٰ بیوی کی طرف سے (جو دولت مند تھیں اور شوقِ حج کا مصمم ارادہ رکھتی تھیں) حج بدل کرانا چاہتے ہیں۔۔۔ حج بدل کرنے والے کو خاص مکہ معظمہ میں وہاں کا زمانہ حج کا خرچ دے کر مقرر کرلینا کافی ہے یا نہیں؟" کے جواب میں امامِ اہلِسنت، سیدی اعلیٰ حضرت الشاہ امام احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں: "حج عبادتِ بدنی اور مالی دونوں سے مرکب ہے، جس پر حج فرض تھا اور معاذاللہ بے کیے مر گیا، ظاہر ہے کہ بدنی حصہ سے تو عاجز ہو گیا۔ **رب عزوجل کی رحمت کہ صرف مالی حصّہ سے اس کی طرف سے حجِ بدل قبول فرماتا ہے، جبکہ وہ وصیت کر جائے اور رحمت پر رحمت یہ کہ وارث کا حج کرانا بھی قبول فرمایا جاتا ہے، اگرچہ میّت نے وصیت نہ کی۔** حجِ بدل والے کو اُسی شہر سے جانا چاہئے، جو شہر میت کا تھا تاکہ مالی صَرف پورا ہو، مکہ معظمہ سے حج کرا دینا اِس میں داخل نہیں۔"[2]

صدر الشریعہ مفتی محمد امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "حج بدل کے لیے چند شرطیں ہیں:۔۔۔(4) جس کی طرف سے کیا جائے، اُس نے حکم دیا ہو، بغیر اُس کے حکم کے نہیں

1...(فتاوی رضویہ، ج10، ص659،660، مطبوعہ رضافاؤنڈیشن، لاھور)

2...(فتاوی رضویہ، ج10، ص661،662، مطبوعہ رضافاؤنڈیشن، لاھور)

ہو سکتا۔ہاں وارث نے مورث (مرحوم) کی طرف سے کیا، تو اِس میں حکم کی ضرورت نہیں۔۔۔۔جس پر حج فرض ہے اور نہ ادا کیا، نہ وصیت کی ، تو بالا جماع گنہگار ہے۔ اگر وارث اُس کی طرف سے حجِ بدل کرانا چاہے، تو کرا سکتا ہے۔ان شاء اللہ تعالیٰ امید ہے کہ ادا ہو جائے۔“[1]

صدر الشریعہ مفتی محمد امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں: ”بہتر یہ ہے کہ حجِ بدل کے لیے ایسا شخص بھیجا جائے، جو خود حجۃ الاسلام (حجِ فرض) ادا کر چکا ہو اور اگر ایسے کو بھیجا، جس نے خود نہیں کیا ہے، جب بھی حجِ بدل ہو جائے گا اور اگر خود اس پر حج فرض ہو اور ادا نہ کیا ہو ، تو اسے بھیجنا مکروہِ تحریمی ہے۔“[2]

واللہ اعلم عزوجل **ورسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

01محرم الحرام1446ھ/08جولائی2024ء

فتوی 41:

حج بدل میں حج کی قربانی کا خرچہ کس پر لازم ہو گا؟

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ میرے ایک دوست کا مسئلہ ہے کہ ان کو ان کا دوست اپنے والد مرحوم کی طرف سے سرکاری حج اسکیم پر حج بدل کے لئے بھیج رہا ہے۔ جس کو بھیجا جا رہا ہے وہ اپنا فرض حج ادا کر چکا ہے، اب جبکہ وہ حج بدل کے لئے جائے گا اور سرکاری حج اسکیم کے حساب سے اس کا حج تمتع ہو گا یعنی پہلے وہ عمرہ کرے گا پھر عمرے کا احرام

1...(بہارِ شریعت، ج1، ص1201، 1202، 1206، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

2...(بہارِ شریعت، ج1، ص1203، 1204، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

کھول دے گا اور ایامِ حج میں حج کا احرام باندھے گا اور یہ بات بھیجنے والے کو بھی معلوم ہے، اس کی طرف سے اس کی اجازت بھی ہے۔ اس کا سوال یہ ہے کہ حج بدل کی قربانی کس پر لازم ہے؟ جس کو بھیجا جا رہا ہے، اس پر یا بھیجنے والے پر لازم ہے کہ اس کے بھی اخراجات دے؟ جو شخص حج بدل کرنے جا رہا ہے، اس کی اتنی استطاعت ہے کہ حج کی قربانی وہ خود کر سکتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

حاجی پر لازم ہونے والے دم / قربانی میں اصول یہ ہے کہ دمِ احصار کے علاوہ جو قربانی بھی حج کی وجہ سے لازم ہو گی جیسے حج قران یا تمتع کی دمِ شکر کی قربانی یا جو دم / قربانی احرام کی وجہ سے لازم ہو جیسے احرام کی خلاف ورزیوں مثلاً: خوشبو لگانے، سلے ہوئے کپڑے پہننے وغیرہ کے سبب دم لازم ہو گیا تو اس قسم کی سب قربانیاں حج بدل کرنے والے پر ہوں گی، وہ اپنی جیب سے ان کی ادائیگی کرے گا، یہ قربانیاں حج کروانے والے پر لازم نہیں، البتہ حج پر بھیجنے والا اسے قربانی کی رقم بھی دے تو یہ ایک عمدہ نیکی ہے، حرم میں قربانی میں اعانت کا ثواب اسے حاصل ہو گا۔

لہٰذا جس کو حج بدل کے لئے بھیجا جائے اور بھیجنے والے نے اسے حج تمتع یا حج قران کی اجازت دی ہو تو حجِ تمتع یا حجِ قران کی قربانی حج کرنے والا اپنے مال سے اپنے نام پر کرے گا، حج بدل کروانے والے کی طرف سے نہیں کرے گا، کیونکہ حجِ تمتع و قران میں حاجی پر دمِ شکر یعنی شکرانے کے طور پر جو قربانی لازم ہوتی ہے، وہ ایک سفر میں حج و عمرہ دونوں عبادتوں کو جمع کرنے کی وجہ سے لازم ہوتی ہے اور ایک سفر میں حج و عمرہ دونوں عبادتوں کو بالفعل جمع کرنے والا یہی حاجی ہوتا ہے قطعِ نظر اس سے کہ شرعی لحاظ سے اس حج کی ادائیگی، جس کی طرف سے حج کیا گیا اس کی

طرف سے ہوتی ہے، حج کرنے والے کی طرف سے نہیں ہوتی مگر حج کی قربانی کا تعلق بالفعل حج کرنے والے سے ہوتا ہے، اس لیے یہ قربانی حاجی پر اسی کے مال سے لازم ہوتی ہے۔اس کے پاس مال نہ ہو تو فقیر شرعی کے لئے جو حکم بیان ہوا ان امور کی ادائیگی اسے کرنا ہوگی۔

حج بدل کی قربانی کس پر لازم ہوگی؟اس کے اصول کو بیان کرتے ہوئے فقیہ النفس امام فخر الدین حسن بن منصوراوزجندی المعروف امام قاضی خان رحمۃ اللہ علیہ (متوفی:593ھ) اپنے فتاوی میں فرماتے ہیں:" الحاج عن المیت اذا کان ماموراً بالقران کان دم القران علی الحاج لا فی مال المیت والاصل فیہ ان کل دم یجب علی المامور بالحج یکون علی الحاج لا فی مال المیت الا دم الاحصار "یعنی میت کی طرف سے حج بدل کرنے والے کو اگر حجِ قِران کا حکم دیا گیا ہو تو قِران کی قربانی حج کرنے والے پر اپنی جیب سے ہوگی، نہ کہ میت کے مال سے، اس مسئلے میں اصول یہ ہے کہ جو دم حج بدل کرنے والے پر واجب ہوگا تو اس کی ادائیگی حج کرنے والے کے ذاتی مال سے کرنا ہوگی نہ کہ میت کے مال سے، سوائے دمِ احصار کے۔[1]

اسی اصول کو مزید واضح انداز میں بیان کرتے ہوئے علامہ رحمۃ اللہ سندھی (متوفی: 800ھ) لباب المناسک میں اور اس کی شرح میں علامہ ملا علی قاری (متوفی:1014ھ) رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:" (جمیع الدماء المتعلقۃ بالحج) ای بنفسہ کدم شکر (والاحرام) ای بارتکاب محظور فیہ کجزاء صید وطیب وحلق شعر وجماع ونحو ذلک (علی المامور) ای اتفاقاً لان الشکر لہ والجبر علیہ (الا دم الاحصار خاصۃ فانہ فی مال الآمر)۔۔۔(حتی لو أمرہ بالقران او التمتّع فالدم علی المامور) ای فی مال نفسہ" یعنی تمام وہ قربانیاں جن کا تعلق خود حج

1...(فتاوی قاضی خان، فصل فی الحج عن المیت، ج01، ص273، مطبوعہ کراچی)

کرنے سے ہوتا ہے جیسے شکرانے کی قربانی اور جن کا تعلق احرام میں کسی خلاف ورزی کرنے سے ہوتا ہے جیسے شکار کرنے کی جزاء، خوشبو لگانے یا بال مونڈنے یا ہمبستری کرنے یا دیگر خلاف ورزیاں کرنے کا دم تو یہ تمام قربانیاں بالاتفاق حج کرنے والے پر لازم ہیں کیونکہ شکر کا موقع اسی کو ملا ہے اور کوئی کوتاہی ہوئی تو اس کی تلافی بھی اسی کے ذمہ ہے سوائے دمِ احصار کے کہ یہ خاص حج پر بھیجنے والے کے مال سے ادا کرنا ہوگا۔ یہاں تک کہ اگر کسی نے دوسرے کو حج قران یا حج تمتع کرنے کا کہا تو تمتع یا قران کی شکرانے کی قربانی حج کرنے والے پر اپنی جیب سے کرنا لازم ہے۔[1]

درِّ مختار میں ہے: ”(ودم القران) والتمتع (والجناية على الحاج) ان أذن له الآمر بالقران والتمتع “یعنی قِران و تمتع کی قربانی اور جنایت کا دَم حج کرنے والے پر ہوگا بشرطیکہ قران و تمتع حجِ بدل کروانے والے کی اجازت سے ہو۔

اس کے تحت فتاوی شامی میں ہے: ”(قوله: على الحاج) اى المامور اما الاول فلانه وجب شكرا على الجمع بين النسكين وحقيقة الفعل منه وان كان الحج يقع عن الآمر لأنه وقوع شرعي لا حقيقي “یعنی ماتن کے قول حاجی سے مراد حجِ بدل کے لئے بھیجا جانے والا شخص ہے۔ پہلی چیز یعنی قران و تمتع کی قربانی حج کرنے والے پر اس وجہ سے لازم ہے کہ یہ حج و عمرہ دونوں عبادتوں کو جمع کرنے کے شکرانے کے طور پر واجب ہوتی ہے اور یہ عبادتیں بالفعل اسی نے ادا کی ہیں، اگرچہ حج کی ادائیگی بھیجنے والے کی طرف سے ہوتی ہے کیونکہ اس کی طرف سے حج کا ہو جانا شرعی معاملہ ہے نہ کہ حقیقی۔[2]

1...(لباب المناسک وشرحہ المسلک المتقسط فی المنسک المتوسط، ص650، مطبوعہ مکہ مکرمہ، ملتقطاً)

2...(الدرّ المختار وردّ المحتار، ج4، ص36، مطبوعہ کوئٹہ)

صدر الشریعہ مفتی امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "مرض یا دشمن کی وجہ سے حج نہ کر سکا یا اور کسی طرح پر محصر ہوا، تو اس کی وجہ سے جو دم لازم آیا، وہ اس کے ذمہ ہے، جس کی طرف سے گیا اور **باقی ہر قسم کے دم اس کے ذمہ ہیں، مثلاً: سلا ہوا کپڑا پہنا یا خوشبو لگائی یا بغیر احرام میقات سے آگے بڑھا یا شکار کیا یا بھیجنے والے کی اجازت سے قران و تمتع کیا۔**" [1]

و اللہ **اعلم** عزوجل و رسولہ **اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

الجواب صحیح

مفتی ابو محمد علی اصغر عطاری مدنی

کتبــــــــــــــــــــــــــــہ

المتخصص فی الفقہ الاسلامی

ابو الحسن رضا محمد عطاری مدنی

16 جمادی الثانی 1446ھ / 19 دسمبر 2024ء

---

1 ...۔ (بہار شریعت، ج 01، حصہ 06، ص 1206، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ)

جنایات

فتوی 42:

حالتِ احرام میں بیلٹ والی چھتری پہننا کیسا؟

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ کیا احرام میں ایسی چھتری سر پر لے سکتے ہیں، جو سر پر تو نہیں لگتی، لیکن اس کے ساتھ جڑی ہوئی ایک لچکدار بیلٹ سر کے چاروں طرف گھومتی ہوئی سر کو لگی رہتی ہے؟ اس بیلٹ کی چوڑائی تقریبا ایک ڈیڑھ انچ ہے اور کیا اس کو پہننے پر کوئی کفارہ بھی لازم آئے گا؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

مُحرِم کے لیے سوال میں بیان کردہ چھتری استعمال کرنا، جائز نہیں ہے، کیونکہ اس کی بیلٹ سر کے چاروں طرف سر کو لگی رہتی ہے اور اتنا حصہ سر کا چھپ جاتا ہے، حالانکہ احرام کی حالت میں سر کو چھپانا، جائز نہیں ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ ایسی بیلٹ سے سر کا چوتھائی سے کم حصہ چھپے گا، لہٰذا اگر پورا دن یا پوری رات تک پہنی تو صدقہ لازم ہو گا اور اگر پورے دن یا پوری رات سے کم وقت کے لیے پہنی، تو کوئی کفارہ لازم نہیں ہو گا، البتہ مکروہ تحریمی و گناہ ہونے کی وجہ سے توبہ لازم ہو گی۔

تفصیل کچھ یوں ہے کہ یہ بیلٹ سر پر لگانا ایسے ہی ہے جیسے سر پر پٹی باندھنا اور احرام کی حالت میں (بلا عذر شرعی) سر پر پٹی باندھنا جائز و ممنوع ہے اور بعض صورتوں میں کفارے کا بھی حکم ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالی عنہما فرماتے ہیں: "لا یعصب المحرم رأسه

بسير، ولا خرقة "ترجمہ: محرم اپنے سر پر نہ چمڑے کے تراشے سے پٹی باندھے اور نہ کپڑے کے ٹکڑے سے۔[(1)]

مبسوط سرخسی میں ہے: "ويكره له أن يعصب رأسه فإن فعل يوما إلى الليل فعليه صدقة؛ لأنه غطى بعض رأسه بالعصابة وهو ممنوع من تغطية الرأس إلا أن ما غطى به جزء يسير من رأسه فتكفيه الصدقة لعدم تمام جنايته "ترجمہ: محرم کے لئے مکروہ ہے کہ وہ اپنے سر پر پٹی باندھے، اگر اس نے ایک پورا دن، یعنی رات ہونے تک پٹی باندھی تو اس پر صدقہ ہے کیونکہ اس نے پٹی کے ذریعے سر کے بعض حصے کو چھپایا ہے حالانکہ اسے سر چھپانا ممنوع ہے، البتہ چونکہ سر کا جتنا حصہ چھپایا، وہ تھوڑا سا ہے اس لئے صدقہ کافی ہے، جنایت کامل نہ ہونے کی وجہ سے۔[(2)]

فتح القدیر میں ہے: "لو عصب المحرم رأسه بعصابة أو وجهه يوما أو ليلة فعليه صدقة، إلا أن يأخذ قدر الربع "ترجمہ: اگر محرم نے سر یا چہرے پر پٹی باندھی ایک دن یا ایک رات تک تو اس پر صدقہ لازم ہے، مگر یہ کہ سر کے چوتھائی حصے کو ڈھانپ لے (کہ پھر دم لازم ہوگا۔)[(3)]

رد المحتار میں نہر اور اس میں خانیہ کے حوالے سے ہے: "ويكره له تعصيب رأسه ولو فعل يوما وليلة كان عليه صدقة. اهـ "ترجمہ: اور محرم کے لئے سر پر پٹی باندھنا مکروہ ہے، اگر اس نے ایک دن یا ایک رات تک ایسا کیا تو اس پر صدقہ ہے۔[(4)]

اس کے علاوہ یہ مسئلہ البحر الرائق (3/9)، البحر العمیق (801/2) اور بدائع (187/2) وغیرہ میں بھی ہے۔

1...(مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الحج، المحرم یعصب راسہ، جلد3، صفحہ184، مطبوعہ ریاض)

2...(المبسوط، کتاب المناسک، باب ما یلبسہ المحرم، جلد4، صفحہ127، دار المعرفہ، بیروت)

3...(فتح القدیر، کتاب الحج، باب الجنایات، جلد3، صفحہ31، دار الفکر، بیروت)

4...(ردالمحتار، کتاب الحج، فصل فی الاحرام، جلد2، صفحہ488، دار الفکر، بیروت)

سر چھپانے پر کتنا کفارہ ہوگا، اس کی تفصیل و تحقیق بیان کرتے ہوئے امام اہلسنت سیدی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان علیہ رحمۃ الرحمٰن لکھتے ہیں: ”فالذي تحرّر مما تقرّر أنّ الكمال في المستور -أعني: الرأس والوجه- بالربع وفي المستور فيه -أعني: اليوم أو الليلة- باستيعاب المقدار فإذا وجد الكمال فيهما فدم أو في أحدهما فصدقة أو لا في شيءٍ منهما فلا شيء إلاّ الكراهة، وهي على ما استظهر ط تحريمية“یعنی بیان کردہ تقریر سے یہ بات منقح ہوئی کہ مستور یعنی سر اور چہرہ میں کمال جنایت چوتھائی حصہ چھپانے سے ہے اور مستور فیہ یعنی دن یا رات کے اعتبار سے کمال جنایت پورے وقت میں فعل پائے جانے سے ہے، لہذا اگر ان دونوں اعتبار سے جنایت کامل ہوئی تو دم لازم ہوگا اور اگر ان میں سے ایک کے اعتبار سے جنایت کامل ہوئی تو صدقہ لازم ہوگا اور اگر کسی ایک کے اعتبار سے بھی جنایت کامل نہ ہوئی تو کوئی کفارہ لازم نہیں ہوگا مگر کراہت لازم آئے گی اور صاحب طحطاوی کے استظہار کے مطابق یہ کراہت تحریمی ہے۔[1]

اشکال: یہ بیلٹ سر پر لگنا ممنوع نہیں ہونا چاہیے کہ لبس معتاد یا ستر معتاد نہیں۔

جواب: ایسا ہرگز نہیں، کیونکہ یہ بیلٹ لباس ناس (یعنی انسانوں کے پہننے) میں سے ہے اور یہ بیلٹ سر پر لگانا عرفا لبس و پہننا ہی شمار کیا جاتا ہے، لہذا یہ ”ما يقصد به التغطية“ میں شامل ہو کر ممنوع و ناجائز ہی قرار پائے گا اور فقہائے کرام نے جن چیزوں کو سر پر اٹھانے کی اجازت دی اور فرمایا کہ ان سے تغطیہ مقصود نہیں ہوتا، اس میں وہ چیزیں شمار کی ہیں، جو لباسِ ناس میں سے نہیں ہیں اور ان کو سر پر اٹھا لیا جائے، تو کوئی بھی پہننا یا سر چھپانا شمار نہیں کرتا، بلکہ اس کا مقصود مطلق حمل (اٹھانا) یا کچھ اور ہوتا ہے۔ جیسے طشت، برتن، پتھر، شیشہ، مٹی کے ڈھیلے وغیرہ۔

---

1 ...۔(جدالممتار، کتاب الحج، باب الجنایات، جلد4، صفحہ324، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ)

بدائع الصنائع اور البحر العمیق میں ہے: واللفظ للبدائع: "ولو حمل علی رأسه شیئا فإن کان مما یقصد به التغطیة من لباس الناس لا یجوز له ذلك؛ لأنه کاللبس، وإن کان مما لا یقصد به التغطیة کإجانة، أو عدل بر وضعه علی رأسه فلا بأس بذلك؛ لأنه لا یعد ذلك لبسا، ولا تغطیة "ترجمہ: اگر محرم نے سر پر کوئی چیز اٹھائی تو اگر یہ چیز لباس ناس میں سے ایسی ہے جس سے تغطیہ (چھپانا) مقصود ہوتا ہے تو اس کا اٹھانا، جائز نہیں ہو گا کیونکہ یہ لبس (پہننے) کی طرح ہو گا اور اگر وہ ایسی چیز ہے جس سے تغطیہ مقصود نہیں ہوتا جیسے برتن (جس میں کپڑے دھوئے جاتے ہیں) یا گندم کی بوری کہ ان کو اگر محرم اپنے سر پر رکھے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ لبس اور تغطیہ شمار نہیں ہو گا۔[1]

رد المحتار میں نہر اور اس میں خانیہ کے حوالے سے ہے: "لو حمل المحرم علی رأسه شیئا یلبسه الناس یکون لابسا، وإن کان لا یلبسه الناس کالإجانة ونحوها فلا "ترجمہ: اگر کسی محرم نے اپنے سر پر ایسی چیز اٹھائی جس کو لوگ پہنتے ہیں تو یہ پہننے والا شمار ہو گا اور اگر لوگ اسے نہیں پہنتے جیسے کپڑے دھونے والا برتن یا اس طرح کی اور چیزیں تو پھر وہ پہننے والا شمار نہیں ہو گا۔[2]

المسالك لعلامۃ کرمانی میں ہے: "فان غطی راسه بشیء مما لا یلبسه الناس عادة کاجانة او عدل او طاسة او مکتل وما اشبه ذلک فلا شیء علیه لانه لا یقصد به تغطیة الراس وانما یقصد به الحمل وغیره "ترجمہ: اگر محرم نے کسی ایسی چیز سے سر کو چھپایا جس کو لوگ عادۃً نہیں پہنتے جیسے کپڑے دھونے والا برتن، بوری، پیتل یا تانبے کا پانی پینے والا برتن، چیز ماپنے کا پیمانہ،

---

1 ...(بدائع الصنائع، کتاب الحج، فصل فی محظورات الاحرام، جلد2، صفحہ185، دارالکتب العلمیہ، بیروت)

2 ...(ردالمحتار، کتاب الحج، فصل فی الاحرام، جلد2، صفحہ488، دارالفکر، بیروت)

یا اس طرح کی دوسری چیزیں تو اس پر کچھ بھی لازم نہیں ہو گا کیونکہ ان چیزوں سے سر چھپانا مقصود نہیں ہوتا بلکہ ان سے مقصود اٹھانا یا کچھ اور ہوتا ہے۔[1]

جن چیزوں سے تغطیہ مقصود نہیں ہوتا، اس کی مزید کچھ مثالیں لباب اور اس کی شرح میں یوں دی گئی ہیں: "(او حجر او مدر او صفر او حدید او زجاج او خشب ونحوھا) ای من فضۃ و ذھب "ترجمہ: یا پتھر یا مٹی کے ڈھیلے یا پیتل یا لوہا یا شیشہ یا لکڑی یا اس طرح کی اور چیزیں جیسے چاندی اور سونا۔[2]

ان جزئیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جن چیزوں سے تغطیہ مقصود نہیں ہوتا، ان میں اور اس بیلٹ میں نمایاں فرق ہے، لہٰذا بیلٹ کو ان چیزوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

الجواب صحیح
مفتی محمد قاسم عطاری

کتبـــــــــــــــــــــــــــــہ
المتخصص فی الفقہ الاسلامی
محمد ساجد عطاری
24 ذو القعدۃ الحرام 1440ھ/29 جولائی 2019ء

فتوی 43:

حالت احرام میں سر یا داڑھی کے بالوں میں کنگھی کرنا کیسا؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں کہ حالتِ احرام میں سر یا داڑھی کے بالوں کو کنگھی کرنے کا کیا حکم ہے؟ رہنمائی فرمائیں۔

1...(المسالک فی المناسک، 711/1، شرکۃ دار البشائر الاسلامیۃ)

2...(المسلک المتقسط، باب الجنایات، صفحہ 436، مؤسسۃ الریان)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

حالتِ احرام میں سر یا داڑھی کے بالوں کو کنگھی کرنا، مکروہ تنزیہی ہے کہ ایک تو اس میں زینت کا پہلو ہے، دوسرا یہ کہ اس میں بال گرنے کا خدشہ ہوتا ہے، جو جنایت کا سبب ہے، لہٰذا حالتِ احرام میں کنگھی کرنے سے بچنا چاہیے، نیز اگر کنگھی کرنے سے بال ٹوٹ گئے، تو اس کے متعلق حکم یہ ہے کہ اگر ایک سے تین تک بال ٹوٹے، تو ہر بال کے بدلے میں ایک مٹھی اناج یا ایک ٹکڑا روٹی یا ایک چھوہارا خیرات کرے اور اگر تین سے زیادہ بال ٹوٹے ہیں، تو صدقہ دے، بہتر یہ ہے کہ ایک بال ٹوٹنے پر بھی پورا صدقہ دے۔

احرام کی حالت میں کنگھی کرنے کے متعلق مناسک ملا علی قاری میں مکروہاتِ احرام کے باب میں ہے: "(ومشط راسہ) لاحتمال قطع شعرہ بہ، ولما فیہ من التزین وازالۃ الشعث فکان الاولیٰ ان یقول: ومشط شعرہ لیشمل لحیتہ ایضا" سر میں کنگھی کرنا، کیونکہ اس میں بال ٹوٹنے کا احتمال ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں زینت ہے اور بالوں کے پراگندہ ہونے کو زائل کرنا ہے، تو اولیٰ یہ ہے کہ مصنف علیہ الرحمۃ یوں کہتے کہ بالوں میں کنگھی کرنا، تاکہ اس میں داڑھی بھی شامل ہو جائے۔[1]

یونہی امام اہلسنت سیدی اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ احرام کے مکروہات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "کنگھی کرنا۔"[2]

صدر الشریعہ بدر الطریقہ مفتی امجد علی اعظمی علیہ رحمۃ اللہ القوی احرام کے مکروہات

1...(مناسک ملا علی قاری، ص120، مطبوعہ ادارۃ القرآن)

2...(فتاویٰ رضویہ، ج10، ص733، رضا فاؤنڈیشن، لاھور)

بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "کنگھی کرنا۔"[(1)]

یہاں مکروہ سے مراد مکروہ تنزیہی ہے، جیسا کہ مخدوم ہاشم ٹھٹھوی علیہ رحمۃ اللہ القوی احرام کے مکروہات تنزیہیہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "شانہ دادن موی سر وریش خود را بعد از تحقق احرام زیر آنکه آن از قسم زینت است ، نیز در ویست احتمال قطع شدن موئها" احرام کے بعد سر یا داڑھی میں کنگھی کرنا (مکروہ تنزیہی ہے)، کیونکہ یہ زینت کی قسم سے ہے اور اس میں بالوں کے ٹوٹنے کا احتمال ہے۔[(2)]

یونہی اسی فصل میں ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: "تزیین محرم بدن خودرا زیرانکه وارد شده است در حدیث که "الحاج الشعث التفل "یعنی حاج کامل کسی است که موئی ژولیده و چرک آلوده باشد" محرم کا اپنے بدن کی زینت کرنا (مکروہ تنزیہی ہے)، کیونکہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ "الحاج الشعث التفل" یعنی کامل حاجی وہ ہے، جو پراگندہ بال اور غبار آلودہ ہو۔[(3)]

اگر احرام کی حالت میں بال ٹوٹ جائیں، تو اس کے کفارے کے متعلق مناسک ملا علی قاری میں ہے: "ولو سقط من راسه او لحیته ثلاث شعرات عند الوضوء او غیره ای حین مسه وحکه۔۔ فعلیه کف من طعام۔۔۔او کسرۃ ای من خبز او تمرۃ لکل شعرۃ، ملتقطا" اگر سر، یا داڑھی کے وضو کرنے یا اس کے علاوہ یعنی چھونے یا کھجانے سے تین بال گریں، تو اس پر ایک مٹھی اناج یا ایک ٹکڑا روٹی یا ایک چھوہارا صدقہ کرنا لازم ہو گا۔[(4)]

1...(بہار شریعت، ج1، حصہ6، ص1079، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

2...(حیاۃ القلوب فی زیارۃ المحبوب، باب اول دربیان احرام، ص25، مخطوطہ)

3...(حیاۃ القلوب فی زیارۃ المحبوب، باب اول دربیان احرام، ص25، مخطوطہ)

4...(مناسک ملا علی قاری، ص327، مطبوعہ ادارۃ القرآن)

تنویر الابصار اور درِ مختار میں ہے: ”(الواجب دم علی محرمٍ اِن حلق) ای: ازال (ربع راسه) او ربع لحیته (وان حلق اقل من ربع راسه) او لحیته (تصدق)، ملخصا“ محرم پر دم واجب ہے اگر اس نے اپنے چوتھائی سر یا اپنی چوتھائی داڑھی کے بال منڈائے یعنی دور کیے اور اگر اپنے سر یا داڑھی کے چوتھائی سے کم بال منڈائے، تو صدقہ دے۔[1]

فتاوی قاضی خان میں ہے: ”ان نتف من راسه او من انفه او لحیته شعرات فبکل شعرة کف من طعام“ اگر اپنے سر یا ناک یا داڑھی سے چند بال نوچے، تو ہر بال کے بدلے میں ایک مٹھی اناج ہے۔[2]

سیدی اعلیٰ حضرت الشاہ امام احمد رضا خان علیہ رحمۃ الرحمٰن فرماتے ہیں: ”وضو کرنے یا کھجانے یا کنگھی کرنے میں جو بال گرے، اس پر بھی پورا صدقہ ہے، اور بعض نے کہا دو تین بال تک ہر بال کے لیے ایک مٹھی اناج یا ایک روٹی کا ٹکڑا یا ایک چھوہارا۔“[3]

صدر الشریعہ بدر الطریقہ حضرتِ علّامہ مولانا مفتی محمد امجد علی اعظمی علیہ رحمۃ اللہ القوی فرماتے ہیں: ”وضو کرنے یا کھجانے یا کنگھا کرنے میں بال گرے، اس پر بھی پورا صدقہ ہے، اور بعض نے کہا دو تین بال تک ہر بال کے لیے ایک مٹھی اناج یا ایک ٹکڑا روٹی یا ایک چھوہارا۔“[4]

صدقے سے مراد صدقۂ فطر ہے اور اس کی مقدار دو کلو میں 80 گرام کم یعنی تقریباً

1...(در المختار مع رد المحتار، ج3، ص651-671، مطبوعہ کوئٹہ)

2...(فتاویٰ قاضی خان، ج1، ص256، دار الکتب العلمیه، بیروت)

3...(فتاویٰ رضویہ، ج10، ص760، رضا فاؤنڈیشن، کراچی)

4...(بہارِ شریعت، ج1، ص1171، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

1920 گرام گندم، یا چار کلو میں 160 گرام کم کھجور یا جَو ہے۔ صدقے میں ان چیزوں کی قیمت بھی دی جاسکتی ہے اور گندم یا جَو کا آٹا یا ستو بھی دے سکتے ہیں۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ''ھی نصف صاعٍ من بر او صاع من شعیر او تمر و دقیق الحنطۃ و الشعیر و سویقھما مثلھما'' یہ گندم سے آدھا صاع یا جو یا کھجور سے ایک صاع ہے اور گندم اور جو کا آٹا اور ان کی مثل دونوں کا ستو۔[1]

لباب المناسک میں صدقے کی مقدار بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ''و یجوز اداء القیمۃ فی الکل'' اور قیمت ادا کرنا سب میں جائز ہے۔[2]

تنبیہ: صدقے کی ادائیگی کے متعلق حکم یہ ہے کہ اس کو حرم میں ادا کرنا ہی ضروری نہیں، بلکہ حرم کے علاوہ کہیں اور ادا کیا، تو بھی صدقہ ادا ہو جائے گا۔ہاں! افضل و بہتر یہی ہے کہ مکہ مکرمہ کے مساکین کو دے کہ اس مسئلے میں امام شافعی رحمہ اللہ کا اختلاف ہے، ان کے نزدیک صدقہ حرم میں ہی دینا ضروری ہے غیر حرم میں نہیں دے سکتے ، اور اس بات پر اجماع ہے کہ جب تک اپنے مذہب کا مکروہ لازم نہ آئے، فقہاء کے اختلاف کی رعایت کرنا مستحب ہے، لہٰذا امام شافعی علیہ الرحمۃ کے قول کی رعایت کرتے ہوئے صدقہ حرم کے مساکین کو دینا افضل و مستحب قرار پائے گا۔

چنانچہ فتاوی عالمگیری میں ہے: ''والافضل ان یتصدق علی فقراء مکۃ ولو تصدق علی غیر فقراء مکۃ جاز'' اور افضل یہ ہے کہ مکہ شریف زادھا اللہ تعالیٰ شرفاً و تعظیماً کے فقراء پر صدقہ

1...(فتاویٰ عالمگیری، ج1، ص191، مطبوعہ کوئٹہ)

2...(المسلک المتقسط علی لباب المناسک، ص399، مطبوعہ ادارۃ القرآن)

کرے، اور اگر مکۃ المکرمہ زادھااللہ تعالیٰ شرفاً و تعظیماً کے فقراء کے علاوہ دوسرے فقیروں پر صدقہ کیا، تو بھی جائز ہے۔[(1)]

بنایہ شرح ہدایہ میں ہے: (ویجوز ان یتصدق بھا علیٰ مساکین الحرم وغیرھم) ای وغیر مساکین الحرم (خلافا للشافعی رحمۃ اللہ علیہ)؛ فان عندہ یجب صرفھا علیٰ مساکین الحرم "اور جنایت کا صدقہ حرم اور غیر حرم کے مساکین کو دینا جائز ہے، بر خلاف امام شافعی رحمہ اللہ کے، کیونکہ ان کے نزدیک وہ حرم کے مساکین کو دینا واجب ہے۔[(2)]

بدائع الصنائع میں ہے: "اما الصدقۃ والصوم : فانھما یجزیان حیث شاء ؛وقال الشافعی : لاتجزیء الصدقۃ الا بمکۃ ؛ وجہ قولہ : ان الھدی یختص بمکۃ فکذا الصدقۃ ، والجامع بینھما : ان اھل الحرم ینتفعون بذلک ، ولنا : قولہ تعالیٰ ﴿ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ﴾ مطلقا عن المکان الا ان النسک قید بالمکان بدلیل ، فمن ادعی تقیید الصدقۃ فعلیہ الدلیل "بہر حال صدقہ اور روزہ، تو یہ کسی بھی مقام پر ادا کیے جاسکتے ہیں، اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مکہ مکرمہ کے علاوہ کہیں اور صدقہ دینا کفایت نہیں کرے گا، ان کے اس قول کی وجہ یہ ہے کہ ہدی مکہ مکرمہ کے ساتھ خاص ہے، یونہی صدقہ بھی اور ان دونوں کو جامع یہ بات ہے کہ اہل حرم اس سے نفع اٹھائیں گے ، ہماری دلیل یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا یہ فرمان" ترجمہ کنز الایمان: "تو بدلے دے روزے یا خیرات یا قربانی" مکان کی قید سے خالی ہے، مگر یہ کہ قربانی دلیل کی وجہ سے مکان کے ساتھ خاص ہے، تو جس نے صدقہ کو مقید کرنے کا دعویٰ کیا ہے، اس پر دلیل لازم ہے۔"[(3)]

1...(فتاوی عالمگیری، ج1، ص244، مطبوعہ کوئٹہ)

2...(بنایہ شرح الھدایہ، ج4، ص450، مطبوعہ کوئٹہ)

3...(بدائع الصنائع، ج3، ص193، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ)

حنفی کے لیے اپنے مذہب کے علاوہ کی رعایت کرنا مستحب ہے، جب تک اپنے مذہب کا مکروہ لازم نہ آئے، جیسا کہ امام اہلسنت سیدی اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: "حتی الامکان چاروں مذہب بلکہ جمیع مذاہب ائمہ مجتہدین کی رعایت ہمارے علماء بلکہ سب علماء مستحب لکھتے ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی علمائے کرام تصریح فرماتے ہیں کہ یہ اسی وقت تک ہے کہ اپنے مذہب کے کسی مکروہ کا ارتکاب نہ ہو، ورنہ ایسی رعایت کی اجازت نہیں۔"[1]

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں: "حنفیہ کے لیے شافعیت مالکیت حنبلیت ان کے خلاف کی رعایت رکھنی بالاجماع مستحب ہے، جب تک اپنے مذہب کا مکروہ نہ لازم آتا ہو۔"[2]

واللہ اعلم عزوجل **ورسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

الجواب صحیح	**کتبـــــــــــــــــــہ**
مفتی فضیل رضا عطاری	ابو سعید محمد نوید رضا عطاری مدنی
	13 جمادی الاولیٰ 1444ھ/08 دسمبر 2022ء

فتوی 44:

احرام کی حالت میں ڈائپر (Diaper) پہننے کا حکم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ کیا احرام کی حالت میں ڈائپر پہن سکتے ہیں؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

احرام کی حالت میں ڈائپر پہننے سے متعلق شرعی حکم یہ ہے کہ جو لباس بھی صورۃً یا معنیً /

1...(فتاویٰ رضویہ، ج8، ص297، رضا فاؤنڈیشن، لاھور)

2...(فتاویٰ رضویہ، ج7، ص224، رضا فاؤنڈیشن، لاھور)

حکماً مخیط ہو، تو ایسے لباس کو احرام کی حالت میں مُعتاد انداز میں (یعنی عادت کے مطابق) پہننا شرعاً جائز نہیں ہوتا۔

ڈائپر کی بنیادی اعتبار سے دو قسمیں ہیں:

عام طور پر مارکیٹ میں دو قسم کے ڈائپر موجود ہوتے ہیں:

ایک وہ جو بالکل بدن کی ہیئت کے مطابق سلے ہوتے ہیں اور اُسے بدن پر پہننے کے بعد چپکانا بھی نہیں پڑتا، بلکہ اُسے انڈر ویئر کی طرح پہن لیا جاتا ہے۔

دوسرے وہ ڈائپر ہوتے ہیں، جو کُھلے ہوئے ہوتے ہیں اور پیڈ کی طرح معلوم ہوتے ہیں، اُسے جسم پر پہنا نہیں جاسکتا، بلکہ اسے جسم پر رکھنے کے بعد سائیڈوں سے چپکانا پڑتا ہے، جس کے بعد وہ جسم پر ٹھہر جاتے ہیں۔

پہلی قسم کے ڈائپر کو احرام کی حالت میں پہننے کا شرعی حکم:

پہلی قسم یعنی انڈرویئر والے ڈائپر کو احرام کی حالت میں پہننے کی شرعاً اجازت نہیں، کیونکہ یہ ڈائپر صورۃً مخیط ہوتا ہے اور مخیط کے ذریعے ہی بدن پر محیط ہوتا ہے اور اُسے معتاد انداز میں ہی پہنا جاتا ہے اور احرام کی حالت میں سلے ہوئے لباس کو معتاد انداز میں (یعنی عادت کے مطابق) پہننا جائز نہیں، جیسا کہ شروع میں بیان ہوا۔

دوسری قسم کے ڈائپر کو احرام کی حالت میں پہننے کا شرعی حکم:

دوسری قسم والے ڈائپر یعنی کھلے ہوئے ڈائپر کو بھی احرام کی حالت میں پہننا شرعاً جائز نہیں کہ یہ اگرچہ صورۃً مخیط نہیں ہوتا، لیکن معنیً و حکماً مخیط ضرور ہوتا ہے اور پھر چونکہ اُسے جسم پر ایک معتاد انداز میں ہی پہنا جاتا ہے جس طرح اس کے پہننے کا انداز ہے، تو دراصل یہ بھی لُبس مخیط

بروجہ معتاد میں داخل ہو کر ممانعت میں پہلے والے ڈائپر کے ساتھ شامل ہو جائے گا، لہٰذا کھلے ہوئے ڈائپر کو اس کے معنیً و حکماً مخیط ہونے کی وجہ سے احرام میں پہننا ممنوع ہو گا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ڈائپر کی مذکورہ بالا دونوں قسمیں ہی حالتِ احرام میں پہننا گناہ ہے اور اسے پہننے کی صورت میں وقت کے قلیل و کثیر ہونے کے اعتبار سے کفارہ یا دم لازم آئے گا۔

واللہ اعلم عزوجل **و رسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

29ربیع الاخر1445ھ/14نومبر2023ء

فتوی 45:

محرم کا منہ سوتے ہوئے چادر سے چھپ جائے تو کیا حکم ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک اسلامی بہن جو کہ حجِ قران کر رہی ہیں، سوتے ہوئے بے خیالی میں اُن کے منہ پر چادر آگئی اور وہ دو گھنٹے تک سوئی رہیں، اب کیا ایسی صورت میں اُن پر دم لازم ہو گا یا صدقہ؟ اگر صدقہ لازم ہو گا، تو یہ صدقہ کہاں اور کس جگہ کے حساب سے دینا ہو گا؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

پوچھی گئی صورت میں چونکہ اُن اسلامی بہن کا پورا یا کم از کم چوتھائی چہرہ لگاتار چار پہر یعنی بارہ گھنٹے تک نہیں چھپا، بلکہ دو گھنٹے یا اس سے بھی کم ہی چھپا ہو گا، تو ایسی صورت میں اُن پر کفارے میں دو صدقہ فطر لازم ہوں گے۔ سونے کی حالت میں بھی چہرہ چھپنے سے اگرچہ کفارے کے لزوم پر کوئی فرق نہیں آئے گا، مگر اس صورت میں چونکہ مُحرمہ کا اپنا قصد و ارادہ نہیں پایا

گیا،لہذا اس صورت میں جنایت کے ارتکاب کے سبب گناہ نہیں ہو گا۔واضح رہے کہ یہاں دو صدقہ فطر لازم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اِس جنایت کا تعلق احرام کے ممنوعات سے ہے،اور اصول یہ ہے کہ جو کام احرام باندھنے کی وجہ سے ممنوع ہو اور احرام کی حالت میں اُس کے ارتکاب سے حج تمتع یا حج افراد کرنے والے پر ایک دم یا ایک صدقہ لازم آتا ہو،تو وہاں قارن پر دو دم یا دو صدقے لازم ہوتے ہیں، کیونکہ قارن نے حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھا ہوتا ہے،لہذا دو احراموں پر جنایت کے سبب کفارے بھی دو لازم ہوں گے۔ نیز صدقہ اپنے شہر کے شرعی فقیر (یعنی جسے زکوۃ دینا، جائز ہے ، ایسے شخص) کو بھی دے سکتے ہیں ، لیکن حرم شریف میں موجود شرعی فقیر کو دینا افضل ہے، اور صدقہ جہاں بھی دے ، بہر حال قیمت اس مقام کے حساب سے دینی ہو گی، جہاں صدقہ ادا کرنے والا ادائیگی کے وقت خود موجود ہو۔

حالت احرام میں چہرے کے چھپ جانے سے متعلق لباب المناسک اور اس کی شرح میں ہے:”(ولو غطی جمیع رأسه أو وجهه بمخیط أو غیره یوما أو لیلة فعلیه دم وفی الأقل من یوم)وکذا من لیلة (صدقة والربع منهما کالکل)“ترجمہ:اگر محرم نے اپنا پورا سر یا چہرہ سلے ہوئے کپڑے یا اس کے علاوہ کسی چیز سے ایک دن یا ایک رات چھپایا تو اس پر دم لازم ہے اور ایک دن یا ایک رات سے کم چھپایا، تو صدقہ لازم ہے اور اس حکم میں چوتھائی سر اور چہرہ پورے سر اور چہرے کی طرح ہے۔[1]

بہار شریعت میں ہے:”مرد یا عورت نے مونھ کی ٹکلی ساری یا چہارم چھپائی، یا مرد نے پورا یا چہارم سر چھپایا، تو چار پہر یا زیادہ لگاتار چھپانے میں دَم ہے اور کم میں صدقہ اور چہارم سے کم

1...(لباب المناسک مع شرحہ، باب الجنایات، صفحہ 435، مطبوعہ مکۃ المکرمہ)

کو چار پہر تک چھپایا تو صدقہ ہے اور چار پہر سے کم میں کفارہ نہیں، مگر گناہ ہے۔"[1]

ممنوعاتِ احرام کا ارتکاب سوتے میں ہو یا جاگتے میں بہر حال کفارہ لازم ہوتا ہے، جیساکہ لباب المناسک اور اس کی شرح میں ہے:"(لا فرق في وجوب الجزاء فيما اذا جنى۔۔۔نائما أو منتبها عند مباشرته)" ملتقطاً۔ ترجمہ: جزاء کے لزوم میں کوئی فرق نہیں ہے ،اس صورت میں جب کوئی سونے کی حالت میں جنایت کرے یا وہ جنایت کرتے وقت چوکنا ہو (بہر حال کفارہ لازم ہو گا)۔[2]

البتہ بحالت نیند قصد نہ ہونے کی وجہ سے جنایت کے وقوع پر گناہ نہیں ہو گا، چنانچہ لباب المناسک میں ہے:" المحرم اذا جنى بغير عمد أو بعذر فعليه الجزاء دون الاثم "ترجمہ: جب محرم بغیر قصد کے یا کسی عذر کی وجہ سے جنایت کرے، تو اس پر کفارہ لازم ہو گا، (مگر) گناہ نہیں ہو گا۔[3]

ممنوعات احرام کے ارتکاب سے جہاں مفرد و متمتع پر ایک دم یا ایک صدقہ لازم ہوتا ہے، وہاں قارن پر دو دم یا دو صدقے لازم ہوتے ہیں، چنانچہ تنویر الابصار مع در مختار میں ہے:"(وكل ما على المفرد به دم بسبب جنايته على إحرامه) يعني بفعل شيء من محظوراته لا مطلقا (فعلى القارن دمان، وكذا الحكم في الصدقة) فتثنى أيضا لجنايته على إحراميه "ترجمہ: اور ہر وہ صورت جس میں احرام پر جنایت کے سبب مفرد پر ایک دم لازم ہوتا ہے، یعنی احرام کے ممنوعات کے ارتکاب کرنے سے ،نہ کہ مطلقاً، تو وہاں قارن پر دو دم لازم ہوتے ہیں اور

1...(بہار شریعت، جلد1، حصہ6، صفحہ1169، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

2...(لباب المناسک مع شرحہ، باب الجنایات، صفحہ423، مطبوعہ مکۃ المکرمہ)

3...(لباب المناسک مع شرحہ، باب الجنایات، صفحہ422، مطبوعہ مکۃ المکرمہ)

یہی حکم صدقہ میں بھی ہے،لہٰذا قارن دو احراموں پر جنایت کے سبب صدقے بھی دو ادا کرے گا۔[1]

صدقہ کی ادائیگی حرم میں ضروری نہیں، اپنے شہر کے شرعی فقیر کو بھی دے سکتے ہیں ،مگر مکہ پاک کے شرعی فقیر کو دینا افضل ہے ،چنانچہ تنویر الابصار مع درِ مختار ورد المحتار میں ہے:وبين القوسين عبارة رد المحتار:"تصدق بنصف صاع من بر كالفطرة۔۔۔أين شاء (أي في غير الحرم أو فيه ولو على غير أهله لإطلاق النص، بخلاف الذبح والتصدق على فقراء مكة أفضل)"ترجمہ: صدقۂ فطر کی طرح آدھا صاع گندم صدقہ کرے، جہاں چاہے یعنی حرم کے علاوہ یا حرم میں، اگرچہ حرم کے فقیر کے علاوہ کسی دوسرے فقیر پر کیونکہ اس بارے میں نص مطلق ہے،بر خلاف جانور ذبح کرنے کے،اور مکہ مکرمہ کے فقیروں پر صدقہ کرنا افضل ہے۔[2]

صدقہ کی ادائیگی میں قیمت اس مقام کے حساب سے دینی ہو گی، جہاں صدقہ ادا کرنے والا ادائیگی کے وقت خود موجود ہو، چنانچہ فتاوی فقیہِ ملت میں ہے:"ایامِ حج میں جو صدقہ واجب ہوتا ہے،اس میں اس مقام کی قیمت معتبر ہو گی، جہاں حاجی صدقہ دے۔"[3]

واللہ اعلم عزوجل **و رسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

07ذی الحجۃ الحرام1445ھ/14جون2024ء

1…(تنویر الابصار مع درمختار، جلد3، صفحہ701، 702، دار المعرفۃ، بیروت)

2…(تنویر الابصار مع درمختار ورد المحتار، جلد3، صفحہ672-671، مطبوعہ کوئٹہ)

3…(فتاوی فقیہ ملت، جلد1، صفحہ359، مطبوعہ شبیر برادرز، لاھور)

فتوی 46:

احرام کی حالت میں پٹی والی چپل پہننے کا حکم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ کیا مرد احرام میں ایسی چپل پہن سکتے ہیں کہ جس میں قدم کا درمیانی حصہ تو کھلا ہوتا ہے لیکن ایک پٹی وسط قدم کی ابھری ہڈی اور ٹخنے کے درمیانی حصے سے اس طرح گزرتی ہے کہ سائیڈوں سے ٹخنوں کا کچھ حصہ چھپ جاتا ہے اور سامنے کی طرف وسط قدم کی ابھری ہڈی سے اوپر پاؤں اور پنڈلی کا جوڑ یا اس کا کچھ حصہ چھپتا ہے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

سوال میں مذکور جوتا مرد کے لئے احرام کی حالت میں پہننا شرعا جائز نہیں، کیونکہ احرام کی حالت میں جوتے کے ذریعے قدم کے درمیان والی ابھری ہڈی کو اور اس سے اوپر والے سارے حصے کو کسی بھی جانب سے چھپانے کی اجازت نہیں ہے، ہاں اس ابھری ہڈی سے نیچے قدم کا جو حصہ چاروں طرف ہے، اسے چھپانے کی اجازت ہے۔

تفصیل کچھ یوں ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے احرام کی حالت میں موزے پہننے کی اس صورت میں اجازت دی جب ان کو اوپر سے اتنا کاٹ دیا جائے کہ وہ کَعبَین (ابھری ہڈیوں) سے نیچے تک ہو جائیں یعنی کَعبَین اور ان کے اوپر والا حصہ ظاہر رہے۔

چنانچہ حدیث پاک کے الفاظ یہ ہیں: "فمن لم یجد النعلین فلیلبس الخفین ولیقطعھما حتی یکونا أسفل من الکعبین" ترجمہ: پس جس کے پاس جوتے نہ ہوں تو وہ موزے پہنے اور

انہیں کاٹ لے یہاں تک کہ وہ ابھری ہڈیوں سے نیچے ہو جائیں۔[1]

اس حدیث پاک میں "کعب" کا لفظ استعمال ہوا ہے اور کعب کا اطلاق دو جگہوں پر ہوتا ہے: (1) ایک تو وہ ہڈی جو پنڈلی اور قدم کے جوڑ پر دائیں بائیں ابھری ہوتی ہے، جسے اردو میں ٹخنہ کہتے ہیں۔ (2) اور دوسری وہ اونچی و ابھری ہڈی جو قدم کے درمیان میں اوپر کی جانب ہوتی ہے۔

حدیث پاک میں ان دونوں میں سے کسی ایک کو متعین نہیں کیا گیا اور اس لفظ کے تحت سابقہ دونوں معنی درست ہو سکتے ہیں، لیکن چونکہ دوسرے معنی یعنی قدم کے درمیان والی ہڈی مراد لینے میں زیادہ احتیاط ہے کہ اس کو مراد لینے کی صورت میں پاؤں کا زیادہ حصہ کھلا رہے گا۔

اس لئے ہمارے فقہائے کرام نے احرام کے باب میں "کعب" سے مراد قدم کے وسط والی ابھری ہڈی ہی مراد لی اور یہ فرمایا کہ اس ہڈی کو اور اس کے اوپر جتنا حصہ ہے، اسے چھپانے کی اجازت نہیں، ہاں اس ہڈی سے نیچے والے حصے کو چھپا سکتے ہیں چاہے وہ قدم کے دائیں بائیں کا حصہ ہو یا سامنے کا یا پیچھے کا۔

الجوہرۃ النیرۃ میں ہے: "والكعب هنا هو الناتئ في وسط القدم عند معقد الشراك" یعنی کعب سے مراد یہاں وہ ہڈی ہے جو قدم کے درمیان میں تسمہ باندھنے کی جگہ پر ابھری ہوتی ہے۔[2]

فتاوی عالمگیری میں ہے: "والكعب هنا المفصل الذي في وسط القدم عند معقد الشراك كذا في التبيين" ترجمہ: کعب یہاں پر وہ جوڑ ہے جو قدم کے درمیان میں تسمہ باندھنے

1...(صحیح بخاری، جلد1، صفحہ82، دار طوق النجاۃ)

2...(الجوھرۃ النیرۃ، جلد1، صفحہ152، المطبعۃ الخیریۃ)

کی جگہ کے قریب ہوتا ہے، ایسا ہی تبیین میں ہے۔[1]

درمختار میں ہے: ” (وخفين إلا أن لا يجد نعلين فيقطعهما أسفل من الكعبين) عند معقد الشراك “یعنی: احرام کے بعد مُحرم موزے پہننے سے بچے اِلّا یہ کہ اگر اس کے پاس جوتے نہ ہوں تو وہ موزوں کو کاٹ لے یہاں تک کہ وہ ان ابھری ہڈیوں سے نیچے ہو جائیں جو تسمہ باندھنے کی جگہ کے قریب ہوتی ہیں۔

” أسفل من الكعبين “ کے تحت علامہ شامی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: ”الذي في الحديث وليقطعهما حتى يكونا أسفل من الكعبين، وهو أفصح مما هنا ابن كمال والمراد قطعهما بحيث يصير الكعبان وما فوقهما من الساق مكشوفا لا قطع موضع الكعبين فقط كما لا يخفى “ترجمہ: حدیث میں جو بات ارشاد ہوئی وہ یوں ہے: ”تو وہ دونوں موزوں کو کاٹ لے یہاں تک کہ وہ ابھری ہڈیوں سے نیچے ہو جائیں۔“ اور یہ الفاظ زیادہ فصیح ہیں بنسبت اس کے جو یہاں استعمال ہوئے، ابن کمال۔ اور مراد یہ ہے کہ موزوں کو یوں کاٹ لیا جائے کہ دونوں ابھری ہڈیاں اور ان سے اوپر جو پنڈلی کا حصہ ہے وہ کھلا رہے نہ یہ کہ فقط ابھری ہڈیوں کی جگہ کو کاٹ لیا جائے جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔

اور ” عند معقد الشراك “ کے تحت لکھتے ہیں: ” وهو المفصل الذي في وسط القدم كذا روى هشام عن محمد، بخلافه في الوضوء فإنه العظم الناتئ أي المرتفع ولم يعين في الحديث أحدهما لكن لما كان الكعب يطلق عليهما حمل على الأول احتياطا لأن الأحوط فيما كان أكثر كشفا بحر “ترجمہ: یہ وہ جوڑ ہے جو قدم کے درمیان میں ہوتا ہے جیسا کہ امام ہشام

---

1 ...(فتاوی عالمگیری، جلد1، صفحہ224، دارالفکر، بیروت)

نے امام محمد سے روایت کیا ہے بخلاف وضو کے، کہ وضو میں اس سے مراد وہ ہڈی ہوتی ہے جو ابھری یعنی بلند ہوتی ہے اور حدیث میں ان دونوں میں سے کسی ایک کو معین نہیں کیا گیا لیکن جب کعب کا اطلاق دونوں ہڈیوں پر ہوتا ہے تو (بابِ احرام میں) احتیاطا اس سے پہلی والی ہڈی (یعنی جو وسط قدم میں ہوتی ہے وہ) مراد لی جائے گی کیونکہ زیادہ احتیاط اس میں ہے جس میں پاؤں کا زیادہ حصہ کھلا رہے، بحر۔[1]

علامہ شامی علیہ الرحمۃ نے ایک مقام پر یہ تحریر فرمایا: "ظاہر یہ ہے کہ احرام میں ایڑیاں چھپانا بھی جائز نہیں" اس پر امام اہلسنت سیدی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان علیہ الرحمۃ نے جد الممتار میں فرمایا: "أقول: بل الظّاهر خلافه على ما اقتضاه ثنيا الحديث: (فليقطعهما حتّى يكونا أسفل من الكعبين) وقد فسّرا هاهنا بِمَعقِد الشِّراك في وسط الرِّجل، وهو مفصل الساق والقدم فإذا بقي مكشوفاً من كلّ جانبٍ جاز سَتر ما وقع تَحته من الصدر والعقب والأطراف جميعاً" ترجمہ: میں کہتا ہوں: بلکہ ظاہر اس کے برخلاف ہے (یعنی ایڑی چھپانا ممنوع نہیں ہے) جیسا کہ اس حدیث کا استثناء تقاضا کرتا ہے "کہ ان موزوں کو کاٹ دے یہاں تک کہ وہ ابھری ہڈیوں سے نیچے ہو جائیں۔" اور ان ابھری ہڈیوں کی تفسیر یہاں پر یہ کی گئی ہے کہ جو قدم کے درمیان میں تسمہ باندھنے کی جگہ ہوتی ہے اور یہ پنڈلی و قدم کا جوڑ ہے پس جب یہ ہر جانب سے کھلا رہے، تو جو اس کا نچلا حصہ ہے، اس کا چھپانا، جائز ہے چاہے وہ قدم کے سامنے کا حصہ ہو یا ایڑی ہو یا بقیہ تمام اطراف ہو۔[2]

غنیۃ الناسک میں ہے: "والمكعب السرموزة ونحوها مما ينتهي الى الكعب يعني

---

1 ...۔(درمختار مع ردالمحتار، کتاب الحج، جلد3، صفحہ572، مطبوعہ کوئٹہ)

2 ...۔(جدالممتار، جلد4، صفحہ313، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ)

وان کان یستر العقب کالکوش الھندی ونحوہ لان النص لم یوجب ان یبالغ فی قطع الخفین حتی یکونا کالسرموزۃ وھو البابوج بل اوجب قطعھما حتی یکونا اسفل من الکعبین سواء کانا کالسرموزۃ او کالکوش الھندی ۔۔۔۔۔نعم لو کان الکوش الھندی یستر العقب وما فوقہ مما یحاذی الکعب ینبغی ان لا یجوز لبسہ لانہ لم یکن اسفل من الکعبین فی کل جانب وھو الظاھر من النص "ترجمہ: اور مکعب سرموزہ وغیرہ جو ابھری ہڈی تک ہی ہوتے ہیں (تو ان کو پہننا جائز ہے) اگرچہ یہ ایڑی کو چھپائیں جیسے ہندی جوتے وغیرہ کیونکہ نص نے یہ واجب نہیں کیا کہ موزوں کو کاٹنے میں اتنا مبالغہ کیا جائے کہ وہ سرموزہ یعنی بابوج (ایک قسم کی جوتی) کی طرح ہو جائیں بلکہ نص نے موزوں کو اتنا کاٹنا واجب کیا ہے کہ جس سے یہ ابھری ہڈیوں سے نیچے ہو جائیں برابر ہے وہ سرموزہ کی طرح ہو جائیں یا ہندی جوتے کی طرح۔ہاں اگر ہندی جوتا ایڑی کو اور ایڑی کے اوپر اس حصے کو چھپائے جو ابھری ہڈی کی محاذات (سیدھ) میں ہے تو اس کو پہننا جائز نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ ہر جانب سے اسفل من الکعبین (ابھری ہڈیوں سے نیچا) نہ ہوا جبکہ نص سے ظاہر یہی ہے۔[1]

مناسک ملا علی قاری پر علامہ حباب اپنے حواشی میں لکھتے ہیں: "قال الشیخ ابو الطیب فی حاشتیہ علی الدر المختار: اقول یستفاد منہ ان الخف یقطع من الکعب بحیث یبقی ما فوقہ الی الساق مکشوفا لا انہ یقطع منہ موضع الکعب فقط اھ" ترجمہ: شیخ ابو الطیب اپنے حاشیہ درمختار میں فرماتے ہیں: "میں کہتا ہوں: اس سے مستفاد ہے کہ موزہ کعب (ابھری ہڈی) سے یوں کاٹا جائے کہ ہڈی سے اوپر پنڈلی تک کا حصہ کھلا رہے نہ یہ کہ فقط ابھری ہڈی کی جگہ کاٹ لی

---

1 ...(غنیۃ الناسک، صفحہ 45، مطبعہ خیریہ، دھلی)

جائے۔[1]

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ قدم کے درمیان میں جو ابھری ہڈی ہوتی ہے، اس سے نیچے والے حصے کو احرام میں چھپانا، جائز ہے، لیکن اس سے اوپر قدم کا جو حصہ ہے اس کو چھپانا، جائز نہیں اور سوال میں جس جوتے کا تذکرہ ہے اس میں اگرچہ قدم کا درمیانی حصہ کھلا ہے، لیکن اس درمیانی حصے سے اوپر کا کچھ حصہ اور ٹخنوں کا کچھ حصہ چھپ رہا ہے، لہٰذا حدیث و فقہ کے مطابق ان جوتوں کو احرام کی حالت میں پہننا جائز نہیں، لہٰذا مرد کو حالتِ احرام میں ایسا جوتا پہننے سے بچنا ہوگا۔

واللہ اعلم عزوجل **و رسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

الجواب صحیح
مفتی فضیل رضا عطاری

کتبــــــــــــــــــــــــــــــــــــہ
المتخصص فی الفقہ الاسلامی
محمد ساجد عطاری
10 ذوالقعدۃ الحرام 1439ھ/24 جولائی 2018ء

فتوی 47:

جس پر دَم لازم ہو اور وہ دَم دینے پر قادر نہ ہو، تو کیا حکم ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے کسی مجبوری کے بغیر سلے ہوئے کپڑے پورے ایک دن تک پہنے رکھے، مگر فقیر ہونے کے سبب دم دینے پر قادر نہیں۔ کیا دم دینے کے لیے وہ قرض لے یا کسی سے مدد مانگے یا اس کے بدلے روزے رکھ لے یا فقط توبہ کر لینا کافی ہے؟

سائل: صوفی اقبال ضیائی (مدینہ منورہ)

1...(حاشیہ حباب علی شرح المنسک المتوسط، صفحہ 58، مخطوط)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق والصواب

پوچھی گئی صورت میں زید پر توبہ کرنے کے ساتھ ساتھ دم دینا بھی واجب ہے، اس کی بجائے روزے رکھنا یا صدقہ دینا یا محض توبہ کر لینا کافی نہیں، کیونکہ یہ جرم اختیاری ہے اور جرمِ اختیاری کے ارتکاب پر جہاں دم واجب ہو، وہاں دم دینا ہی لازم ہوتا ہے، اس کے بجائے صدقہ یا روزے رکھنا کفایت نہیں کرتا، البتہ دم کی ادائیگی فی الفور لازم نہیں، بلکہ بعد میں بھی دیا جاسکتا ہے، لہٰذا اگر زید کے پاس فی الوقت دم دینے کی استطاعت نہیں، تو انتظار کرے، جب استطاعت ہو تو خود یا کسی معتمد فرد کے ذریعے حرم میں ایک بکری ذبح کروادے، قرض لے کر دم کی ادائیگی کر سکتا ہو، تو قرض لے کر کرے۔ اگر زندگی میں دم ادا نہ کیا تھا کہ وفات کا وقت قریب آ گیا، تو وصیت کرنا واجب ہے، بغیر وصیت کیے فوت ہو گیا، تو گنہگار ہو گا۔

کپڑے بغیر عذر ایک دن تک پہنے ہوں تو دم واجب ہے، اس کے بدلے کوئی دوسری چیز دینا جائز نہیں۔ جیسا کہ مناسک ملا علی قاری میں ہے: "اذا فعل شیئا من ذلک علی وجہ الکمال ای مما یوجب جنایۃ کاملۃ **بان لبس یوما** او طیب عضوا کاملا ونحو ذلک **فان کان ای فعلہ بغیر عذر فعلیہ الدم عینا ای حتما معینا وجزما مبینا لا یجوز عنہ غیرہ بدلا اصلا**" ترجمہ: جب محرم نے مذکورہ کسی چیز کو علی وجہ الکمال کیا یعنی اتنی مقدار میں کہ جس سے جنایت کامل ہو جائے مثلاً ایک دن لباس پہنا یا ایک پورے عضو کو خوشبو لگالی وغیرہ تو اگر محرم نے کسی عذر کے بغیر ارتکابِ جرم کیا ہو تو اس پر معین و لازمی طور پر دم دینا واجب ہے، اس کے علاوہ کوئی چیز اس کا بدل اصلاً نہیں ہو سکتی۔[1]

---

[1]...(مناسک علی القاری، باب فی جزاء الجنایات، فصل فی جزاء اللبس، ص 551، مکۃ المکرمۃ)

دم دینا متعین طور پر واجب ہو، تو اس کی جگہ روزہ رکھنا یا قیمت دینا وغیرہ کافی نہیں۔ جیسا کہ علامہ علی قاری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: ”حیث وجب الدم عینا لا یجوز عنہ ای بدلہ غیرہ من الصدقۃ والصوم والقیمۃ ای لا قیمۃ الھدی ولا قیمۃ الصدقۃ وانما یسقط بالاراقۃ فی الحرم“ ترجمہ: جہاں معین طور پر دم واجب ہے، اس کے بدلے کوئی دوسری شے یعنی صدقہ فطر ادا کرنا یا روزہ رکھنا یا صدقہ فطر یا ہدی کی قیمت دینا جائز نہیں، بلکہ حرم میں دم کا جانور قربان کرنے سے ہی دم ساقط ہو گا۔[1]

دم دینے پر قادر نہ ہونا، روزے رکھنے کا اختیار لینے کے لیے عذر نہیں، دم دینا متعذر ہو، تو دم ذمہ پر باقی رہے گا۔ جیسا کہ علامہ شامی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: ”**وعدم القدرۃ علی الکفارۃ فلیست باعذار فی حق التخییر**، ولو ارتکب المحظور بغیر عذر فواجبہ الدم عینا او الصدقۃ فلا یجوز عن الدم طعام او صیام ولا عن الصدقۃ صیام **فان تعذر علیہ ذلک بقی فی ذمتہ**“ ترجمہ: کفارے کی ادائیگی پر قادر نہ ہونا متبادل صورت کو اختیار کرنے کا عذر نہیں، لہٰذا اگر بغیر عذر کسی ممنوع کام کا ارتکاب کیا تو اس پر بعینہ دم یا صدقہ ہی واجب ہو گا (یعنی ان دونوں میں سے جو لازم آئے گا وہی دینا پڑے گا، اختیار نہیں ہو گا) لہٰذا دم کے بدلے کھانا کھلانا یا روزے رکھنا جائز نہیں ہو گا اور نہ ہی صدقے کے بدلے روزے رکھنا جائز ہو گا، اگر دم یا صدقہ دینا متعذر ہو تو بھی یہ چیزیں ذمہ پر باقی رہیں گی۔[2]

دم اور کفارے علی التراخی واجب ہوتے ہیں۔ نیز زندگی میں ادا نہ کیا، تو مرتے وقت وصیت کرنا واجب ہے۔ جیسا کہ لباب المناسک میں ہے: ”اعلم ان الکفارات کلھا واجبۃ علی

1...(مناسک علی القاری، باب فی جزاء الجنایات، فصل فی انواع الکفارات، ص 569، مکۃ المکرمۃ)

2...(ردالمحتار، کتاب الحج، باب الجنایات، ج 3، ص 671، کوئٹہ)

التراخي فلا یاثم بالتاخیر عن اول وقت الامکان ویکون مودیالا قاضیا فی ای وقت ادیٰ وانما یتضیق علیہ الوجوب فی آخر عمرہ فی وقت یغلب علی ظنہ ان لولم یؤدہ لفات فان لم یؤد فیه فمات اثم ویجب علیه الوصیة بالاداء۔۔۔ والافضل تعجیل اداء الکفارات"

ترجمہ: جان لو کہ تمام کفارے علی التراخی واجب ہیں لہٰذا ادائیگی پر قادر ہونے کے باوجود تاخیر کرنے پر گنہگار نہیں ہو گا، جب بھی ادا کرے گا، ادا ہی ہو گا، قضا نہیں ہو گا البتہ عمر کے آخری حصے میں جب اسے موت کا ظن غالب ہو جائے کہ اب ادا نہ کیا تو کفارہ ذمہ پر باقی رہ جائے گا تو اسی وقت کفارہ ادا کرنے کا وجوب متوجہ ہو گا اور بغیر ادا کیے فوت ہو گیا تو گنہگار ہوا اور کفارہ ادا کرنے کی وصیت کرنا اس پر واجب ہے۔ افضل یہ ہے کہ کفارے جلدی ادا کر دے۔[1]

بغیر عذر جرم کا ارتکاب کیا تو اب صرف مقررہ کفارہ دینے سے برئ الذمہ ہو گا۔ جیسا کہ فتاوی رضویہ میں ہے: "اگر بے عذر ایک دن کامل یا ایک رات کامل یا اس سے زائد سر چھپا رہا تو خاص حرم میں ایک قربانی ہی کرنی ہو گی جب چاہے کرے، دوسرا طریقہ کفارہ کا نہیں۔"[2]

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــــہ

مفتی ابو محمد علی اصغر عطاری مدنی

14 رمضان المبارک 1440ھ/20 مئی 2019ء

فتوی 48:

احرام میں wet tissue (خوشبو سے تر ٹشو) استعمال کرنا

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین اِس مسئلے کے بارے میں کہ اِحرام کی حالت میں ایسا ٹشو استعمال کرنا کہ جو خوشبو سے تَر ہوتا ہے، اُسے انگریزی میں بھی " Wet

1...(لباب المناسک، باب فی جزاء الجنایات، ص542، مکۃ المکرمۃ)

2...(فتاوی رضویہ، ج10، ص713، رضا فاؤنڈیشن، لاھور)

Tissue"یعنی گیلا ٹشو ہی کہا جاتا ہے۔ اگر مُحرِم اُس سے مکمل ہاتھوں کو صاف کرے، تو کیا حکم ہو گا؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

حالتِ احرام میں خوشبو سے تَر ٹشو (Wet Tissue) کے ذریعے ہاتھوں کو صاف کرنے سے مُحرِم پر دَم واجب ہو گا۔

اِس مسئلے کی تفصیل یہ ہے کہ خوشبو دار ٹشو پیپر میں اگر خوشبو کا عَین موجود ہے یعنی وہ پیپر خوشبو سے بھیگا ہوا ہے، تو اُس تری کے بدن پر لگنے کی صورت میں جو حکم خوشبو کا ہوتا ہے، وُہی اس کا بھی ہو گا، یعنی اگر خوشبو قلیل (کم) ہے اور عُضوِ کامِل (یعنی پورے عُضْو) کو نہیں لگی، تو مُحرِم پر صدقہ واجب ہے اور اگر خوشبو کثیر (یعنی زیادہ) ہو یا پورے عُضْو کو لگ جائے، تو دم واجب ہے۔ اب جبکہ سوال کے مطابق مُحرِم نے اُس خوشبو سے بھیگے ٹشو سے مکمل ہاتھ کو صاف کیا تو دَم واجب ہو گا، کیونکہ ہاتھ ایک کامِل عضو ہے اور کامل عضو کو خوشبو لگنے کی صورت میں دَم واجب ہوتا ہے، اور اگر پورے ہاتھ کو نہ لگی، لیکن اُس ٹشو سے لگنے والی خوشبو اِتنی زیادہ ہو کہ اُس پر "کثیر" یعنی بہت زیادہ خوشبو ہونے کا اِطلاق ہو تو بھی دَم واجب ہو گا۔

اوپر مسئلہ میں "دَم" کے واجب ہونے کا ذکر ہوا۔ دَم سے مراد ایک بکرا ہے، اِس میں نَر، مادہ، دُنبہ، بھیڑ، نیز گائے یا اونٹ کا ساتواں حصہ سب شامل ہیں، نیز اِس جانور کا حرم میں ذبح ہونا شرط ہے اور مزید یہ کہ اِس دم میں دیے جانے والے جانور میں سے نہ تو آپ خود کچھ کھا سکتے ہیں اور نہ ہی کسی غنی کو کھلا سکتے ہیں، وہ صرف محتاجوں کا حق ہے۔

جسم پر خوشبو لگنے کے متعلق علامہ علی قاری حنفی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات:1014ھ/

1605ء) لکھتے ہیں: "لو اصاب جسدہ ای کلہ او **عضوا کاملا** او اکثر او اقل **طیب کثیر** فعلیہ دم وان غسل من ساعتہ" ترجمہ: اگر محرم کے پورے جسم پر یا ایک عضوِ کامل یا اس کے اکثر پر خوشبو لگی یا عضو کے تھوڑے حصے پر کثیر خوشبو لگی تو مُحرِم پر دم واجب ہے، اگرچہ اُس نے اُسے فوراً دھو لیا ہو۔[1]

ہاتھ عضوِ کامل ہے، علامہ شیخ رحمت اللہ سندھی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات: 993ھ / 1585ء) لکھتے ہیں: "العضو کالراس واللحیۃ والشارب والید" ترجمہ: عضو، جیسے سَر، داڑھی، مونچھیں اور ہاتھ ہیں۔[2]

اگر خوشبو پر "کثیر" کا اطلاق ہو سکے، تو پھر "عضوِ کامل" کا بھی اعتبار نہیں رہتا، بلکہ خوشبو کے کثیر ہونے کی بنیاد پر ہی دَم واجب ہو جاتا ہے، چنانچہ علامہ شیخ رحمت اللہ سندھی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ نے لکھا: "ان کان الطیب کثیرا فالعبرۃ بالطیب ای لا بالعضو" ترجمہ: اگر خوشبو کثیر ہو، تو خوشبو کا ہی اعتبار ہو گا، عضو کا اعتبار نہیں ہو گا۔[3]

دم کی مقدار بیان کرتے ہوئے امامِ اہلِ سُنَّت، امام اَحمد رضا خان رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات: 1340ھ / 1921ء) لکھتے ہیں: "اِس فصل میں جہاں دَم کہیں گے اس سے مراد ایک بھیڑ یا بکری ہو گی، اور بدنہ اونٹ یا گائے، یہ سب جانور اُن ہی شرائط کے ہوں جو قربانی میں ہوں۔"[4]

دم کی ادائیگی حرم میں کرنا ضروری ہے، نیز اُس میں سے خود کچھ نہیں کھا سکتے، چنانچہ

1...(المسلک المتقسط مع حاشیۃ ارشاد الساری، فصل فی التداوی بالطیب، صفحہ 452، مطبوعہ ملتان)

2...(لباب المناسک مع شرحہ للقاری، باب الجنایات، صفحہ 312، مطبوعہ ادارۃ القران والعلوم الاسلامیۃ)

3...(لباب المناسک مع شرحہ للقاری، باب الجنایات، صفحہ 312، مطبوعہ ادارۃ القران والعلوم الاسلامیۃ)

4...(فتاویٰ رضویہ، جلد 10، صفحہ 757، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاھور)

صدرالشریعہ مفتی محمد امجد علی اعظمی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ(سالِ وفات:1367ھ/1947ء) لکھتے ہیں: ”کفارہ کی قربانی یا قارِن و متمتع کے شکرانہ کی غیر حرم میں نہیں ہو سکتی، اگر غیر حرم میں کی تو ادا نہ ہوئی، نیز شکرانہ کی قربانی سے آپ کھائے، غنی کو کھلائے، مساکین کو دے اور کفارہ کی قربانی صرف محتاجوں کا حق ہے۔ملتقطاً۔“[1]

امیرِ اہلِ سنت مولانا الیاس عطار قادری اطال اللہ عمرہ لکھتے ہیں: ”دَم یعنی ایک بکرا، اِس میں نر، مادہ، دنبہ، بھیڑ، نیز گائے یا اونٹ کا ساتواں حصہ سب شامل ہیں۔“[2]

دَم کی مقدار، معیار اور دیگر شرائط کو علامہ سندھی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ نے تفصیلاً بیان کیا ہے، اُس کا خلاصہ وہی ہے جسے اوپر رفیق المعتمرین اور نیچے بہارِ شریعت کی عبارتوں میں ذکر کر دیا گیا ہے، آپ رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ نے باقاعدہ اِس عنوان پر فصل بنام ”فصل فی احکام الدماء وشرائط جوازِھا“ قائم فرمائی۔[3]

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

28جمادی الاولی1443ھ/02جنوری2022ء

فتوی49:

عمرے میں سعی کرنے سے پہلے حلق کروالیا، تو کیا حکم ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کوئی

1...(بہارِ شریعت، جلد1، حصہ6، صفحہ1162، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

2...(رفیق المعتمرین، صفحہ137، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

3...(لباب المناسک، کتاب الحج، صفحہ244، مطبوعہ دارقرطبۃ)

شخص عمرہ میں لا علمی کی وجہ سے سعی کیے بغیر احرام کھولنے کی نیت سے سر منڈا کر احرام اُتار دے ، تو اس کا کیا کفارہ ہو گا، کیا دَم دینا پڑے گا یا دوبارہ عمرہ کرنا ہو گا؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملك الوهاب اللهم هداية الحق و الصواب

عمرے میں سعی کرنا واجب ہے اور اس سعی میں ایک واجب یہ ہے کہ حلق یا تقصیر سے پہلے حالتِ احرام میں سعی کی جائے اور سعی کرنے سے پہلے ہی حلق یا تقصیر کروا لینے سے دم لازم ہو جاتا ہے، لیکن اس سے سعی ساقط نہیں ہوتی، بلکہ اب بھی اس کی ادائیگی واجب ہی رہتی ہے، یعنی دم دینا بھی ضروری ہے اور رہ جانے والی سعی کرنا بھی ضروری ہے، البتہ اب سعی کے لیے دوبارہ احرام باندھنا ضروری نہیں، بلکہ عمرہ کرنے والا جب سعی سے پہلے حلق کروا کر احرام کھول دے، تو اب بغیر احرام کے عام لباس میں ہی سعی کرے گا۔

اس تفصیل کے بعد پوچھی گئی صورت کا متعین جواب یہ ہے کہ جس شخص نے لا علمی کی وجہ سے سعی کیے بغیر احرام اتارنے کی نیت سے سر منڈوایا اور احرام اتار دیا، اُس پر حدودِ حرم کے اندر ایک دم ادا کرنا لازم ہو چکا اور اب حکم یہ ہے کہ وہ سعی بھی کرے اور دم بھی ادا کرے، مکمل عمرہ کرنا لازم نہیں اور اب سعی کے لیے دوبارہ احرام باندھنا بھی ضروری نہیں، بلکہ بغیر احرام کے عام لباس میں ہی سعی کرلے۔ اور دَم سے مراد ایک بکرا ہے، اِس میں نَر، مادہ، دُنبہ، بھیڑ، نیز گائے یا اونٹ کا ساتواں حصہ سب شامل ہیں، نیز اِس جانور کا حدودِ حرم میں ذبح ہونا شرط ہے، مزید یہ کہ اِس دم میں دیئے جانے والے جانور میں سے نہ تو خود کچھ کھا سکتے ہیں اور نہ ہی کسی غنی کو کھلا سکتے ہیں، بلکہ وہ صرف محتاجوں کا حق ہے۔

عمرے میں حلق یا تقصیر سے پہلے سعی کرنا واجب ہے، چنانچہ شمس الائمہ، امام سَرَخْسی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات:483ھ/1090ء) لکھتے ہیں: ”والسعي من أعمال العمرة فعليه أن يأتي به قبل التحلل بالحلق“ ترجمہ: اور سعی عمرے کے افعال میں سے ہے، لہٰذا عمرہ کرنے والے پر واجب ہے کہ حلق کے ذریعے احرام سے باہر نکلنے سے پہلے سعی کا واجب ادا کرے۔[1]

حلق یا تقصیر سے پہلے سعی، حالتِ احرام میں کرنا واجب ہے، چنانچہ سعی کے واجبات بیان کرتے ہوئے علامہ شیخ رحمت اللہ بن عبد اللہ سندھی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات:993ھ/1585ء) لکھتے ہیں: ”وكونه في حالة الاحرام في سعي العمرة“ ترجمہ: اور عمرہ کی سعی کرنے والے کا حالتِ احرام میں ہونا واجب ہے۔[2]

اور سعی سے پہلے حلق کروالینے سے دم واجب ہونے اور سعی ساقط نہ ہونے کے متعلق علامہ علی قاری حنفی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات:1014ھ/1605ء) لکھتے ہیں: ”يجب أن لا يحلّ بحلق أو تقصير حتى يسعى بينهما **فإنّه لوخالفه يجب عليه دم ولا يسقط عنه السعي** اتّفاقاً“ ترجمہ: عمرہ کرنے والے پر واجب ہے کہ جب تک سعی نہ کرلے، حلق یا تقصیر کے ذریعے احرام نہ کھولے، پس اگر اس نے اس کی مخالفت کی (یعنی سعی سے پہلے حلق یا تقصیر کرکے احرام اتار دیا)، تو اس پر بالاتفاق دم واجب ہوگا اور سعی بھی ساقط نہیں ہوگی۔[3]

مزید اسی میں لکھتے ہیں: ”لو طاف ثم حلق ثم سعى صحّ سعيه وعليه دم لتحلّله قبل وقته وسبقه على أداء واجبه“ ترجمہ: اگر عمرہ کرنے والے نے طواف کرکے حلق کروالیا، پھر سعی

1...(المبسوط، جلد4، صفحہ52، مطبوعہ دارالمعرفہ، بیروت، لبنان)

2...(لباب المناسک وعباب المسالک، باب السعی بین الصفا والمروۃ، صفحہ128، مطبوعہ دارقرطبہ)

3...(شرح لباب المناسک مع حاشیۃ ارشاد الساری، باب السعی بین الصفا والمروہ، صفحہ248، مطبوعہ مکہ)

کی، تو اس کی سعی درست ہو گئی، مگر وقت سے پہلے اِحرام کھول کر حلال ہونے اور واجب کی ادائیگی سے پہلے حلق کروانے کی وجہ سے اس پر دم لازم ہو گا۔[1]

صدر الشریعہ مفتی محمد امجد علی اعظمی رَحۡمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیۡہِ(سالِ وفات:1367ھ/1947ء) لکھتے ہیں: "عمرہ کی سعی میں احرام واجب ہے یعنی اگر طواف کے بعد سر مونڈا لیا پھر سعی کی، تو سعی ہو گئی، مگر چونکہ واجب ترک ہوا، لہٰذا دَم واجب ہے۔[2]"

اور صورتِ مذکورہ میں صرف ایک ہی دم لازم ہو گا، کیونکہ سب سے پہلے والے محظورِ شرعی کے ارتکاب کے وقت رفضِ احرام کی نیت پائی گئی ہے، لہٰذا اگر اس کے بعد دیگر ممنوع کاموں کا بھی ارتکاب کر لیا، مثلاً: حلق کروا کر سلے ہوئے کپڑے بھی پہن لیے، تب بھی اس پر ایک ہی دم لازم آئے گا، چنانچہ "رفضِ احرام" اور "وجوب دم" کے متعلق شرح لباب المناسک مع حاشیہ ارشاد الساری میں ہے: "(اعلم أنه إذا نوى رفض الاحرام) اى قصد ترک الاحرام بمباشرة المحظور على وفق ظنه (فجعل يصنع ما يصنعه الحلال من لبس الثياب) اى الممنوعة من المخيط ونحوه (فإنه لا يخرج بذلك من الاحرام) اى بالاجماع (وعليه) اى يجب (أن يعود كما كان محرما) اى ولا يرتكب بعد ذلک محظورا (ويجب دم واحد لجميع ما ارتکب، ولو فعل المحظورات) اى استحسانا عندنا... (وإنما يتعدد الجزاء بتعدد الجنايات إذا لم ينو الرفض) اى فى اول ارتكابها (ثم نية الرفض إنما تعتبر ممن زعم أنه يخرج منه) اى الاحرام (بهذا القصد) اى فى ارتكاب الجناية" ملتقطاً ترجمہ: تُو جان لے! مُحۡرِم جب اپنے گمان کے مطابق ممنوعاتِ احرام میں سے کسی کام کے ذریعے احرام کھولنے کا ارادہ کرے اور کوئی ایسا

1...(شرح لباب المناسک مع حاشیۃ ارشاد الساری، باب السعی ۔۔الخ، صفحہ 248، مطبوعہ مکہ)

2...(بہار شریعت، جلد 1، حصہ 6، صفحہ 1109، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ، کراچی)

کام کرلے جو غیر مُحْرِم کرتا ہے، یعنی غیر محرم کی طرح سلے ہوئے کپڑے پہنے اور اِسی کی مثل دوسرے کام (مثلاً: خوشبو لگائے، حلق کروائے) تو ان کی وجہ سے وہ محرم بالاجماع کیفیتِ احرام سے باہر نہیں نکلے گا، بلکہ اُس پر واجب ہو گا کہ جیسے پہلے مُحْرِم تھا، اُسی حالت پر واپس لوٹ آئے (جیسا کہ صورتِ مسئولہ میں دوبارہ سعی لازم ہوگی) اور اس کے بعد دیگر ممنوع کام نہ کرے (لیکن اگر کسی نے کرلیا، تو) اِن تمام ممنوع اُمور کا ارتکاب کرنے کے سبب اُس پر ایک ہی دم لازم ہو گا، اگرچہ وہ سارے ہی محظورات کا ارتکاب کر لے۔۔۔ اور متعدد جنایات سے متعدد دم اس صورت میں لازم ہوتے ہیں، جب پہلے ممنوع کام کا ارتکاب کرتے ہوئے رفضِ احرام کی نیت نہ کی ہو۔ پھر رفضِ احرام کی نیت اُسی کی معتبر ہے، جو یہ گمان کرتا ہو کہ وہ اس جرم کے ارتکاب سے احرام سے نکل جائے گا۔[1]

اور حلق کروالینے کے بعد سعی کرنے میں احرام لازم نہ ہونے کے متعلق علامہ علی قاری حنفی رَحْمَةُاللهِ تَعَالٰی عَلَیْہِ لکھتے ہیں: ”سعی الحجّ بعد الوقوف لا یشترط فیه الاحرام بل ویسنّ عدمه وکذا سعی العمرة لا یشترط وجوده بعد حلقه بل یجب تحققه قبل حلقه“ ترجمہ: وقوف عرفہ کے بعد حج کی سعی میں احرام شرط نہیں، بلکہ احرام نہ ہونا سنت ہے، اسی طرح عمرہ کی سعی جب حلق کروانے کے بعد کی جائے، تو اس میں احرام پہننا شرط نہیں، بلکہ حلق سے پہلے سعی کرنے میں اِحرام واجب ہے۔[2]

دَم کی تفصیل بیان کرتے ہوئے امامِ اہلِ سُنَّت، امام اَحمد رضا خان رَحْمَةُاللهِ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات: 1340ھ/1921ء) لکھتے ہیں: ”اِس فصل میں جہاں دم کہیں گے اس سے مراد ایک بھیڑیا

1...(شرح لباب المناسک مع حاشیۃ ارشاد الساری، باب فی جزاء الجنایات، صفحہ 578، مطبوعہ مکہ)

2...(شرح لباب المناسک مع حاشیۃ ارشاد الساری، باب السعی۔۔الخ، صفحہ 504، مطبوعہ مکہ)

بکری ہوگی اور بدنہ اونٹ یا گائے، یہ سب جانور اُن ہی شرائط کے ہوں جو قربانی میں ہوں۔"[1]

دم کی ادائیگی حرم میں کرنا ضروری ہے، نیز اُس میں سے خود کچھ نہیں کھا سکتے، چنانچہ صدرالشریعہ مفتی محمد امجد علی اعظمی رَحْمَةُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ لکھتے ہیں: "کفارہ کی قربانی یا قارِن و متمتع کے شکرانہ کی، غیر حرم میں نہیں ہو سکتی، اگر غیر حرم میں کی تو ادا نہ ہوئی، نیز شکرانہ کی قربانی سے آپ کھائے، غنی کو کھلائے، مساکین کو دے اور کفارہ کی قربانی صرف محتاجوں کا حق ہے۔" ملتقطاً۔[2]

امیرِ اہلِ سنت مولانا محمد الیاس عطار قادری اطال اللہ عمرہ لکھتے ہیں: "دَم یعنی ایک بکرا، اِس میں نر، مادہ، دنبہ، بھیڑ، نیز گائے یا اونٹ کا ساتواں حصہ سب شامل ہیں۔" [3]

واللہ اعلم عزوجل **ورسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبــــــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

29 رجب المرجب 1444ھ/21 فروری 2023ء

1...(فتاویٰ رضویہ، جلد 10، صفحہ 757، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

2...(بہارِ شریعت، جلد 1، حصہ 6، صفحہ 1162، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ، کراچی)

3...(رفیق المعتمرین، صفحہ 137، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ، کراچی)

متفرقات

فتوی 50:

کیا فی زمانہ سفری سہولیات کے پیش نظر عورت بغیر محرم سفر حج کر سکتی ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ زید کا کہنا ہے کہ آج کے دور میں سفر میں بہت سہولیات پیدا ہو چکی ہیں، سفر آسان، محفوظ اور تیز ہو چکا ہے اور حج کے لیے عورتوں کے حکومتی سطح پر گروپس تیار کیے جاتے ہیں، تو عورتیں محفوظ ہوتی ہیں، لہٰذا آج کے دور میں عورت بغیر محرم کے سفر حج کر سکتی ہے اور احادیث میں جو بغیر محرم کے سفر کی ممانعت ہے وہ پہلے دور کے اعتبار سے ہے جب سفر اونٹوں گھوڑوں پر ہوتا تھا، سفر کرنے میں کئی کئی دن لگ جاتے تھے اور غیر محفوظ بھی ہوتا تھا اور وہ اپنی دلیل کے طور پر یہ روایت بھی بیان کرتا ہے کہ: ”قال فإن طالت بك حياة، لترين الظعينة ترتحل من الحيرة، حتى تطوف بالكعبة لا تخاف أحدا إلا الله۔۔۔قال عدي: فرأيت الظعينة ترتحل من الحيرة حتى تطوف بالكعبة لا تخاف إلا الله“ ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ و آلہ وسلم نے (حضرت عدی رضی اللہ تعالی عنہ سے) ارشاد فرمایا: اگر تمہاری عمر لمبی ہوئی، تو تم اونٹ پر سوار عورت کو دیکھو گے کہ وہ حیرہ سے سفر کرے گی، یہاں تک کہ کعبہ کا طواف کرے گی اس حال میں کہ اسے اللہ تعالی کے سوا کسی کا خوف نہیں ہو گا، حضرت عدی رضی اللہ تعالی عنہ نے فرمایا: میں نے اونٹ پر سوار عورت کو دیکھا جو حیرہ سے چل کر خانہ کعبہ کا طواف کر رہی تھی اس حال میں کہ اسے اللہ تعالی کے سوا کسی کا خوف نہیں تھا۔[1]

1...(صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الاسلام، ج04، ص197، دار طوق النجاۃ)

زید اس سے استدلال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس سے پتا چلا جب امن و امان اور محفوظ سفر ہو، تو عورت تنہا سفر حج کر سکتی ہے۔ شرعی رہنمائی فرمائیں کہ زید کا یہ استدلال درست ہے یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

زید کا یہ استدلال اور عندیہ شرعا درست نہیں ہے۔ جس کی چند وجوہ درج ذیل ہیں:

(الف) نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ و آلہ وسلم نے یہ خبر عطا فرمائی تھی کہ ایسا ہو گا، لیکن یہ کہاں فرمایا کہ ایسا شرعا درست ہو گا اور اس وقت عورتوں کو بغیر محرم سفر شرعی کرنے کی اجازت ہو گی، جبکہ اس کے مقابل واضح طور پر احادیث میں بغیر محرم سفر کی ممانعت فرمائی ہے۔

(ب) نیز سوال میں مذکورہ روایت میں تو عورت کے تنہا سفر کرنے کا ذکر ہے، جبکہ زید رفقا اور خواتین کے گروپ کے ساتھ سفر کرنے کی بات کر رہا ہے، تو زید کا موقف اس روایت کے بھی مطابق نہیں۔

(ج) نیز زید نے آج کے دور کی بات کی ہے، جبکہ سوال میں مذکور روایت میں تو پچھلے دور کی بات ہے اور سوال میں موجود روایت کے مطابق اس وقت اتنا پر امن دور تھا کہ تنہا عورت کو سفر کرنے کی صورت میں کسی لُٹیرے وغیرہ کا خوف نہیں تھا، جبکہ ہمارے اس دور میں امن کی یہ حالت نہیں ہے کہ بغیر کسی کی معیت کے عورت تنہا اتنا سفر کرے اور اسے کسی لُٹیرے وغیرہ کا خوف ہی نہ ہو، تو یوں بھی زید کا استدلال درست نہیں۔

(د) نیز زید بھی صرف سفر حج بغیر محرم کرنے کا ذکر کر رہا ہے، جبکہ بعض روایات میں غیرِ حج کے بھی عورت کے تنہا سفر کرنے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، تو اگر زید کے طریقہ استدلال کو

اختیار کیا جائے، تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ غیرِ سفر حج کے لیے بھی عورت بغیر محرم کے سفر کر سکتی ہے، جبکہ یہ بات اجماع کے خلاف ہے۔

عورت کو بغیر محرم کے سفر کرنے کی ممانعت سے متعلق روایات:

صحیح بخاری میں ہے:" قال النبي صلى الله عليه وسلم:لا تسافر المرأة إلا مع ذي محرم،ولا يدخل عليها رجل إلا ومعها محرم، فقال رجل:يا رسول الله إني أريدأن أخرج في جيش كذا و كذا وامرأتي تريد الحج، فقال: اخرج معها"ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:عورت بغیر محرم کے سفر نہ کرے اور محرم کی غیر موجودگی میں کوئی اس کے پاس نہ آئے،اس پر ایک شخص نے عرض کی: یارسول اللہ عزوجل وصلی اللہ تعالی علیہ و آلہ وسلم !میں فلاں فلاں لشکر میں جانا چاہتا ہوں اور میری عورت حج کرنا چاہتی ہے، تو آپ صلی اللہ تعالی علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:تم اپنی عورت کے ساتھ جاؤ۔[1]

مزید بخاری شریف میں ہے:"ولا تسافرن امرأة إلا ومعها محرم، فقام رجل فقال: يا رسول الله،اكتتبت في غزوة كذا و كذا، وخرجت امرأتي حاجة، قال: اذهب فحج مع امرأتك" ترجمہ:اور ہر گز کوئی عورت بغیر محرم کے سفر نہ کرے،اس پر ایک شخص کھڑا ہو کر عرض گزار ہوا،میرا نام فلاں فلاں غزوے میں لکھا گیا ہے اور میری عورت حج کے ارادے سے نکلی ہے ، آپ صلی اللہ تعالی علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:تم جاؤ اور اپنی عورت کے ساتھ حج کرو۔[2]

صحیح مسلم شریف میں یہی روایت یوں بیان کی گئی ہے:"ولا تسافر المرأة إلا مع ذي

1...(صحیح البخاری،باب حج النساء،ج03،ص19،دارطوق النجاۃ)

2...(صحیح البخاری، کتاب الجہاد،ج04،ص59،دارطوق النجاۃ)

محرم، فقام رجل، فقال: یا رسول اللہ، إن امرأتي خرجت حاجة، وإني اکتتبت في غزوة کذا و کذا، قال: انطلق فحج مع امرأتك" ترجمہ: اور عورت بغیر محرم کے سفر نہ کرے، پس ایک شخص کھڑے ہو کر عرض گزار ہوا: یارسول اللہ عزوجل وصلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم میری عورت حج کے لیے نکلی اور میرا نام فلاں فلاں غزوے میں لکھا گیا ہے، آپ صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جاکر اپنی عورت کے ساتھ حج کرو۔ [1]

غیر حج کے لیے عورت کے سفر کا واقعہ:

ترمذی شریف میں ہے: "فإني لا أخاف علیکم الفاقة، فإن اللہ ناصرکم و معطیکم حتی تسیر الظعینة فیما بین یثرب والحیرة أو أکثر ما یخاف علی مطیتها السرق" ترجمہ: مجھے تم پر فاقہ کا کوئی خوف نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالی تمہارا مددگار اور تمہیں عطا فرمانے والا ہے، یہاں تک کہ اونٹ پر سوار عورت یثرب اور حیرہ کے درمیان کی مسافت یا اس سے زیادہ کی مسافت اس حال میں طے کرے گی کہ اس کی سواری پر چور کا خوف نہیں ہو گا۔ [2]

زید کی ذکر کردہ روایت کے جوابات:

جو حدیث پاک زید نے اپنے استدلال میں پیش کی ہے، اس کے جواب میں محقق علی الاطلاق، حضرت علامہ امام ابن ہمام علیہ الرحمۃ فتح القدیر میں فرماتے ہیں: "وأما حدیث عدي بن حاتم، فلیس فیه بیان حکم الخروج فیه ما هو ولا یستلزمه، بل بیان انتشار الأمن، ولو کان مفیدا لاباحة کان نقیض قولهم فإنه یبیح الخروج بلا رفقة ونساء ثقات" ترجمہ: اور جہاں تک

1...(صحیح المسلم، باب سفر المراۃ مع محرم الی حج وغیرہ، ج02، ص978، داراحیاء التراث العربی، بیروت)

2...(جامع ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، ج05، ص53، بیروت)

معاملہ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ تعالی عنہ کی روایت کا ہے، تو اس روایت میں اس دور میں سفر کرنے کا حکم بیان نہیں کیا گیا کہ حکم کیا ہے؟ اور نہ یہ اس کو مستلزم ہے، بلکہ اس میں تو امن و امان کے عام ہونے کا بیان ہے اور اگر بالفرض اس میں سفر کرنے کے حکم کا بیان ہو، تو یہ شوافع کے موقف کے بر خلاف ہو گا کہ اس صورت میں روایت بغیر رفقاء اور ثقہ عورتوں کے تنہا عورت کو سفر کرنے کی اجازت ثابت کرے گی۔ (جبکہ شوافع کے نزدیک تو عورت ثقہ عورتوں کے ساتھ سفر کر سکتی ہے، تنہا سفر نہیں کر سکتی۔)[1]

بنایہ شرح ہدایہ میں اس کے تحت ہے: "قلت: حديث عدي هذا يدل على الوقوع، ولا يدل على الجواز بوجه من وجوه الدلالة بمطابقته، ولا بالتزامه؛ لأنه ورد في معرض الثناء على الزمان بالأمن والعدل، وذكر خروج المرأة على ذلك بلا خفير لبيان الاستدلال عليه، ولا يقال: تأخير البيان عن وقت الحاجة لا يجوز؛ لأنا نقول: ما أخره بل بين حرمة خروجها في عدة أحاديث صحيحة ثابتة" ترجمہ: میں کہتا ہوں: حدیث عدی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ایسا معاملہ وقوع پذیر ہو گا اور اس میں دلالت کے کسی طریقہ کے مطابق جواز کی دلیل نہیں ہے، نہ دلالت مطابقیہ کے مطابق اور نہ دلالت التزامیہ کے مطابق، کیونکہ اس روایت میں اس زمانے کے عدل اور امن و امان کے ذریعے اس کی تعریف بیان کی گئی ہے اور اس عدل و امن و امان پر استدلال کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ عورت بغیر کسی محافظ کے سفر کرے گی، اور یہ اعتراض نہیں کیا جائے گا کہ وقت حاجت سے بیان کو مؤخر کرنا، جائز نہیں ہوتا، کیونکہ ہم کہیں گے کہ آپ صلی اللہ تعالی علیہ و آلہ وسلم نے بیان کو موخر نہیں فرمایا، بلکہ کئی احادیث صحیحہ ثابتہ میں عورت کے تنہا سفر کی حرمت کو بیان فرمایا ہے۔[2]

1...(فتح القدیر، کتاب الحج، ج02، ص421، دار الفکر، بیروت)

2...(البنایۃ شرح الهدایہ، کتاب الحج، ج04، ص153، دار الکتب العلمیہ، بیروت)

تبیین الحقائق میں ہے: ”وحديث عدي يدل على الوقوع وليس فيه دلالة على الجواز فلايلزم حجة وهذا لأنه - عليه الصلاة والسلام - ساق الكلام لبيان أمن الطريق من العدل لا لبيان أنها يجوز لها أن تسافر بغير محرم ولا زوج، نظيره قوله - عليه الصلاة والسلام - فبه لیأتين على الناس زمان تسير الظعينة من مكة إلى الحيرة لا يأخذ أحد بخطام راحلتها الحديث **وأجمعوا أنها لا يحل لها أن تسير من مكة إلى الحيرة ولا من بلد إلى بلد آخر بالقياس عليه**“ ترجمہ: اور حضرت عدی رضی اللہ تعالی عنہ والی روایت صرف اس پر دلالت کرتی ہے کہ ایسا واقع ہو گا اور اس میں اس کے جائز ہونے کی دلیل نہیں ہے، پس یہ ہمارے خلاف حجت نہیں بن سکتی اور یہ اس لیے ہے کہ آپ صلی اللہ تعالی علیہ و آلہ وسلم نے کلام مبارک اس زمانے میں عدل وانصاف کی وجہ سے راستے کے امن کو بیان کرنے کے لیے فرمایا ہے، نہ یہ بیان کرنے کے لیے کہ اسے بغیر محرم اور شوہر کے سفر کرنا، جائز ہو گا، اس کی نظیر آپ صلی اللہ تعالی علیہ و آلہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ اونٹ پر سوار عورت مکہ سے حیرہ کی طرف سفر کرے گی اس کی سواری کی نکیل کو کوئی تھامنے والا نہیں ہو گا **اور سب کا اجماع ہے کہ اس پر قیاس کرتے ہوئے عورت کے لیے مکہ سے حیرہ کی طرف اور کسی شہر سے دوسرے شہر کی طرف سفر کرنا حلال نہیں ہے۔**[1]

واللہ اعلم عزوجل **ورسولہ اعلم** صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم

الجواب صحیح	کتبـــــــــــــــــــــــــہ
مفتی ابو الحسن محمد ھاشم خان عطاری	المتخصص فی الفقہ الاسلامی
	محمد عرفان مدنی
	13 شوال المکرم 1441ھ/05 جون 2020ء

---

1 ...(تبیین الحقائق، کتاب الحج، ج02، ص06، قاھرہ)

فتوی 51:

جس عورت کا کوئی محرم نہ ہو تو کیا وہ بغیر محرم عمرہ کرنے جاسکتی ہے؟

کیا فرماتے علمائے دین ومفتیان شرع متین اس بارے میں کہ ایک طلاق یافتہ خاتون ہیں، جن کی طلاق کی عدت گزر چکی ہے، ان کا بھائی، والد کوئی بھی نہیں ہے، نہ ہی کسی قسم کا دوسرا کوئی مَحرم ہے، صرف ان کی والدہ ہیں، وہ اپنی والدہ اور کزن وغیرہ کے ساتھ عمرہ کی ادائیگی کے لیے جاسکتی ہیں؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

پوچھی گئی صورت میں اس طلاق یافتہ خاتون کے لیے والدہ اور کزن وغیرہ کے ساتھ عُمرے پر جانا، جائز نہیں، کیونکہ حکم شرعی یہ ہے کہ جب عورت کو حج وعمرہ یا کسی اور کام کے لیے تین دن کی راہ (یعنی 92 کلو میٹر) یا اس سے زائد کا سفر کرنا ہو، تو اس کے ساتھ شوہر یا محرم کا ہونا ضروری ہے، اس کے بغیر یہ سفر ناجائز و گناہ ہے، اگر سفر کرے گی، تو قدم قدم پر اس کے لیے گناہ لکھا جائے گا، لہٰذا اس خاتون کو چاہیے کہ جب اس کا شوہر یا مَحرم نہیں، تو شریعت مطہرہ کی پیروی کی خاطر اس ارادے کو ترک کر دے اور یہ ہمیشہ کے لیے یاد رکھیں کہ حج وعمرہ کا مقصود اللہ کریم کی رضا و ثواب کا حصول ہوتا ہے، جو اسی وقت پورا ہو سکتا ہے، جبکہ یہ شریعت مطہرہ کے احکامات کی رعایت کے ساتھ ہو، ورنہ نہیں۔

سنن ترمذی شریف میں ہے: ”عن أبي سعيد الخدری، قال: قال رسول اللہ صلى اللہ علیہ وسلم: «لا یحل لامرأة تؤمن باللہ والیوم الآخر أن تسافر سفرا یکون ثلاثة أیام فصاعدا إلا ومعها أبوها، أو أخوها، أو زوجها، أو ابنها، أو ذو محرم منها“ ترجمہ: حضرت ابو سعید خدری رضی

اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو عورت اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہو، اس کے لیے تین دن یا اس سے زائد کا سفر کرنا حلال نہیں، مگر اسی صورت میں جبکہ اس کے ساتھ اس کا باپ یا بھائی یا شوہر یا بیٹا یا کوئی بھی محرم ہو۔[1]

اسی طرح بخاری و مسلم شریف میں ہے، بالفاظ متقاربۃ: "ولا تسافرن امرأة إلا ومعها محرم، فقام رجل فقال: يا رسول الله، اكتتبت في غزوة كذا وكذا، وخرجت امرأتي حاجة، قال: اذهب فحج مع امرأتك" ترجمہ: اور ہر گز کوئی عورت بغیر محرم کے سفر نہ کرے، اس پر ایک شخص کھڑا ہو کر عرض گزار ہوا کہ یا رسول اللہ! میرا نام فلاں فلاں غزوے میں لکھا گیا ہے اور میری عورت حج کے ارادے سے نکلی ہے، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم جاؤ اور اپنی عورت کے ساتھ حج کرو۔[2]

علامہ بدر الدین عینی علیہ الرحمۃ عمدۃ القاری میں لکھتے ہیں: "وفيه: أن النساء كلهن سواء في منع المرأة عن السفر، إلا مع ذي محرم۔۔وقوله صلى الله عليه وسلم: (لا تسافر المرأة إلا مع ذي محرم) عام في كل سفر، فيدخل فيه الحج" ترجمہ: اور اس حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ محرم کے بغیر سفر کرنے کی ممانعت میں سب عورتیں برابر ہیں۔۔۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ عورت بغیر محرم کے سفر نہ کرے، ہر سفر کو شامل ہے، تو اس میں حج بھی داخل ہے۔[3]

امام اہلسنت سیدی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان علیہ الرحمۃ رسالہ انوار البشارۃ میں لکھتے

1...(سنن الترمذی، باب ما جاء فی کراھیۃ ان تسافر المراۃ وحدھا، ج03، ص464، مطبعۃ مصطفی، مصر)

2...(صحیح البخاری، ج04، ص59، دار طوق النجاۃ) (صحیح المسلم، ج02، ص978، دار احیاء التراث، بیروت)

3...(عمدۃ القاری، ج10، ص222، دار إحياء التراث العربي، بيروت)

ہیں: "عورت کے ساتھ جب تک شوہر یا محرم بالغ قابل اطمینان نہ ہو جس سے نکاح ہمیشہ کو حرام ہے، سفر حرام ہے، اگر کرے گی، تو حج ہو جائے گا، مگر ہر قدم پر گناہ لکھا جائے گا۔"[1]

اسی طرح اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ سے عورت کے بغیر محرم سفر حرمین طیبین کرنے کے متعلق سوال ہوا تو فرمایا: "عورت اگرچہ عفیفہ یا ضعیفہ ہو اسے بے شوہر یا محرم سفر کو جانا حرام ہے ۔۔اگر چلی جائے گی، تو گنہگار ہو گی، ہر قدم پر گناہ لکھا جائے گا۔"[2]

صدرالشریعہ مفتی امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: " عورت کو مکہ تک جانے میں تین دن یا زیادہ کا راستہ ہو، تو اُس کے ہمراہ شوہر یا محرم ہونا شرط ہے، خواہ وہ عورت جوان ہو یا بوڑھیا۔"[3]

واللہ اعلم عزوجل **و رسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــــــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

04 جمادی الاولیٰ 1446ھ/07 نومبر 2024ء

فتویٰ 52:

جوان لڑکی کا اپنی والدہ اور ماموں کے لڑکے کے ساتھ عمرے پر جانا کیسا؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک خاتون اپنے بھتیجے کے ساتھ عمرے پر جارہی ہے۔ اس خاتون کی ایک جوان بیٹی بھی ہے، وہ خاتون چاہتی ہے کہ یہ بھی ہمارے ساتھ عمرے پر چلی جائے، تو کیا اس لڑکی کا یوں سفر کرنا، جائز ہے یا نہیں؟

1...(فتاویٰ رضویہ، رسالہ انوار البشارۃ، ج10، ص726، رضا فاؤنڈیشن، لاھور)

2...(فتاویٰ رضویہ، ج10، ص707،706، رضا فاؤنڈیشن، لاھور)

3...(بہارِ شریعت، ج1، ص1044، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

اور والدہ کے ساتھ ہونے کی وجہ سے کچھ چھوٹ ملے گی یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق والصواب

پوچھی گئی صورت میں وہ خاتون تو اپنے بھتیجے کے ساتھ سفر کر سکتی ہے، مگر اس کی بیٹی نہیں جاسکتی، والدہ کے ساتھ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، لڑکی کے لئے اس کا اپنا محرم کا ہونا ضروری ہے جبکہ ماموں زاد غیر محرم ہوتے ہیں اور ان سے پردہ لازم ہے، لہٰذا وہ خاتون خود جانا چاہے، تو جاسکتی ہے، مگر اپنی بیٹی کو ساتھ نہیں لے جاسکتی ہے، کیونکہ شریعت مطہرہ میں کسی بھی عورت کو شوہر یا محرم کے بغیر شرعی مسافت یعنی 92 کلومیٹر کی مسافت پر واقع کسی جگہ جانا حرام ہے، خواہ وہ سفر حج و عمرہ کی غرض سے ہو یا کسی اور مقصد کے لیے ہو۔

صحیح مسلم میں ہے: "عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم لا یحل لامرأۃ تؤمن باللہ و الیوم الاخر ان تسافر سفراً یکون ثلاثۃ ایام فصاعداً الا ومعھا ابوھا او ابنھا او زوجھا او اخوھا او ذومحرم منھا" سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا: جو عورت اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہے، اس کے لیے تین دن یا اس سے زیادہ کا سفر کرنا حلال نہیں ہے، مگر جبکہ اس کے ساتھ اس کا باپ یا بیٹا یا شوہر یا بھائی یا اس کا کوئی محرم ہو۔[1]

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: "و منھا المحرم للمراۃ شابۃ کانت او عجوزاً اذا کانت بینھا و بین مکۃ مسیرۃ ثلاثۃ ایام" ترجمہ: اور عورت کے لئے (حج فرض ہونے کے لیے) محرم کا ساتھ ہونا شرط ہے، عورت جوان ہو یا بوڑھی، جبکہ اس کے اور مکۃ المکرمہ کے درمیان تین دن کا فاصلہ

1...(الصحیح لمسلم، باب سفر المرأۃ مع محرم الی حج وغیرہ، جلد 1، صفحہ 434، مطبوعہ کراچی)

ہو۔[1]

سیدی اعلیٰ حضرت امام اہلسنت مولانا الشاہ امام احمد رضا خان علیہ رحمۃ الرحمٰن فتاویٰ رضویہ میں فرماتے ہیں: ”عورت اگرچہ عفیفہ (یعنی پاکدامن) یا ضعیفہ (یعنی بوڑھی) ہو، اسے بے شوہر یا محرم سفر کو جانا، حرام ہے۔۔۔ اگر چلی جائے گی، گنہگار ہوگی، ہر قدم پر گناہ لکھا جائے گا۔“[2]

صدر الشریعہ مفتی محمد امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: ”عورت کو مکہ تک جانے میں تین دن یا زیادہ کا راستہ ہو تو اس کے ہمراہ شوہر یا محرم ہونا شرط ہے، خواہ وہ عورت جوان ہو یا بڑھیا۔ محرم سے مراد وہ مرد ہے جس سے ہمیشہ کے لئے اس عورت کا نکاح حرام ہے، خواہ نسب کی وجہ سے نکاح حرام ہو، جیسے باپ، بیٹا، بھائی وغیرہ یا دودھ کے رشتہ سے نکاح کی حرمت ہو، جیسے رضاعی بھائی، باپ، بیٹا وغیرہ یا سسرالی رشتہ سے حرمت آئی، جیسے خسر، شوہر کا بیٹا وغیرہ۔“[3]

ماموں زاد وغیرہ سے پردہ کرنے سے متعلق اعلیٰ حضرت امام اہلسنت الشاہ امام احمد رضا خان علیہ رحمۃ الرحمن لکھتے ہیں: ”جیٹھ، دیور، بہنوئی، پھپا، خالو، چچازاد، ماموں زاد، پھپی زاد، خالہ زاد بھائی یہ سب لوگ عورت کے لئے محض اجنبی ہیں۔“[4]

واللہ اعلم عزوجل **ورسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

الجواب صحیح
مفتی محمد قاسم عطاری

کتبـــــــــــــــــــــــہ
المتخصص فی الفقہ الاسلامی
ابوحذیفہ محمد شفیق عطاری مدنی
28 شعبان المعظم 1440ھ/04 مئی 2019ء

1۔۔۔(الفتاویٰ الھندیہ، کتاب الحج، جلد 1، صفحہ 218، 219، مطبوعہ کوئٹہ)
2۔۔۔(فتاویٰ رضویہ، جلد 10، صفحہ 706، 707، رضافاؤنڈیشن، لاھور)
3۔۔۔(بہارشریعت، جلد 1، صفحہ 1044، مکتبۃ المدینہ، کراچی)
4۔۔۔(فتاوی رضویہ، جلد 22، صفحہ 217، رضافاؤنڈیشن، لاھور)

فتوی 53:

23 ذوالقعدہ کو مکہ پہنچنے والا حاجی نماز میں قصر کرے گا؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص حج کے لیے کسی دوسرے ملک سے سفر کرتا ہوا 23 ذیقعدہ کو ظہر سے پہلے مکہ مکرمہ پہنچا اور 8 ذوالحجۃ الحرام کو اس کا منیٰ جانے کا ارادہ ہے۔ تو اب مکہ پہنچنے پر وہ نمازیں قصر پڑھے گا یا پوری؟ کیونکہ اگر ذیقعدہ 30 کا ہوا، تو پھر 15 دن بن جائیں گے، ورنہ نہیں اور حاجی کو مکہ پہنچتے ہی اس کا پتا نہیں لگ سکتا وہ تو کچھ دن بعد ہی چاند کا پتا لگے گا، لہٰذا وہ نمازیں کیسے پڑھے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق والصواب

صورتِ مسئولہ میں یہ شخص قصر نماز ادا کرے گا، کیونکہ یہ شخص سفر شرعی کر کے آیا ہے یعنی مسافر ہے اور مسافر جب کسی جگہ پورے پندرہ دن رہنے کی حتمی نیت کرے، تو اس وقت وہ اس جگہ مقیم ہوتا ہے اور اب اس نے قصر کی بجائے پوری نماز پڑھنی ہوتی ہے، لیکن اگر پندرہ دن رہنے کی نیت حتمی وجزمی نہ ہو، بلکہ اس میں ابہام وتردد ہو، تو ایسی نیت سے مسافر مقیم نہیں بنتا، بلکہ شرعاً وہ اس کی حالتِ سفر ہی شمار ہوتی ہے اور اس پر قصر کرنا لازمی ہوتا ہے۔ اور حج کے لیے 23 ذیقعدہ کو پہنچنے والے کی نیت بھی پندرہ دن کی حتمی وجزمی نہیں ہوتی، بلکہ نیت میں تردد واستثناء موجود ہوتا ہے کہ اگر چاند انتیس کا ہو گیا تو میں پندرہ دن سے قبل چلا جاؤں گا، لہٰذا جب نیت جزمی نہیں، بلکہ اس میں تردد ہے، تو ایسا شخص مقیم نہیں بنے گا، بلکہ مسافر ہی رہے گا۔

حلبہ میں غایہ کے حوالے سے ہے: "نیۃ الاقامۃ خمسۃ عشر یوما یعتبر عزمہ علی

الثبات" ترجمہ: پندرہ دن رہنے کی نیت میں اس کا پختہ عزم ہونا معتبر ہے۔[1]

شرح سیر کبیر للسرخسی میں ہے: "وإن دخل المسلمون أرض الحرب فانتهوا إلى حصن و وطنوا أنفسهم على أن يقيموا عليه شهرا إلا أن يفتحوه قبل ذلك، أخبرهم الوالي بذلك، فإنهم يقصرون الصلاة. لأنهم لم يعزموا على إقامة خمس عشرة ليلة لمكان الاستثناء، فالفتح قبل مضي خمس عشرة ليلة محتمل" ترجمہ: اور اگر مسلمان دار الحرب میں داخل ہوئے اور کسی قلعے کے پاس پہنچ کر یہ نیت کر لی کہ ہم یہاں ایک مہینا رہیں گے، اِلَّا یہ کہ ہم اس سے پہلے فتح حاصل کر لیں، یہ بات ان کو لشکر کے والی نے بتائی، تو تمام افراد قصر نماز ہی ادا کریں گے، کیونکہ ان کا پندرہ راتیں رہنے کا عزم نہیں، اس لیے کہ درمیان میں استثناء موجود ہے، کیونکہ پندرہ راتوں سے قبل بھی فتح ہو جانے کا احتمال ہے۔[2]

امام ابن ہمام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب میں اسی مسئلے کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ومجرد نية الإقامة لا تتم علة في ثبوت حكم الإقامة كما في المفازة، فكانت البلد من دار الحرب قبل الفتح في حق أهل العسكر كالمفازة من جهة أنها ليست بموضع إقامة قبل الفتح؛ لأنهم بين أن يهزموا فيقروا أو يهزموا فيفروا، فحالتهم هذه مبطلة عزيمتهم؛ لأنهم مع تلك العزيمة موطنون على أنهم إن هزموا قبل تمام الخمسة عشر وهو أمر مجوز لم يقيموا، وهذا معنى قيام التردد في الإقامة فلم تقطع النية عليها، ولا بد في تحقق حقيقة النية من قطع القصد،...... وعلى هذا قالوا فيمن دخل مصرا لقضاء حاجة معينة ليس غير ونوى الإقامة خمسة عشر يوما لا يتم، وفي أسير انفلت منهم ووطن على إقامة خمسة عشر في غار ونحوه لم يصر مقيما" ملتقطا ترجمہ: محض اقامت کی نیت کر لینا اقامت کا حکم ثابت کرنے کے لیے

1...(حلبہ، جلد2، صفحہ528، دار الکتب العلمیہ، بیروت)

2...(شرح سیر کبیر، صفحہ245، ناشر: الشرکۃ الشرقیۃ للاعلانات)

علت نہیں، جیسا کہ جنگل میں نیت کر لینے کا معاملہ ہے، لہٰذا فتح حاصل کر لینے سے قبل سپاہیوں کے حق میں دار الحرب کا یہ شہر جنگل کی طرح ہی ہے، اس اعتبار سے کہ فتح سے قبل یہ اقامت کی جگہ نہیں، کیونکہ وہ دو معاملوں کے درمیان ہوتے ہیں کہ اگر انہوں نے (کفار کو) شکست دے دی تو رُک جائیں گے اور اگر شکست ہوئی تو یہاں سے فرار ہو جائیں گے، لہٰذا ان کی حالت ان کے ارادے کو باطل کرنے والی ہے، کیونکہ جب ان کا یہ ارادہ ہے تو یہ اس طور پر یہاں رکے ہیں کہ اگر پندرہ دن سے قبل ان کو شکست ہو گئی، جو ایک ممکن امر ہے، تو یہ اقامت نہیں کریں گے، اور یہی مطلب ہے اقامت میں تردد ہونے کا کہ اقامت کی نیت قطعی و حتمی نہیں ہے جبکہ سچی نیت کے تحقق کے لیے قطعی ارادے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے علماء فرماتے ہیں جو شخص کسی شہر میں اپنی مخصوص حاجت کے لیے آیا اور اس کے علاوہ اس کا کوئی مقصد نہیں اور اس نے پندرہ دن رکنے کی نیت کر لی، تو وہ پوری نماز نہیں پڑھے گا، یونہی قیدی جب کفار سے چھوٹ کر بھاگا اور کسی غار وغیرہ میں پندرہ دن رکنے کی نیت کر لی، تو وہ مقیم نہیں ہو گا۔[1]

غنیہ میں اسی مسئلے کے ضمن میں ہے: ”ولا بد في تحقق النية من الجزم“ ترجمہ: (اقامت کی) نیت کے تحقق کے لیے جزم ہونا ضروری ہے۔[2]

صاحب در مختار نے یہ مسئلہ لکھا کہ ”فلو دخل الحاجّ مكة أيّام العشر لَم تصحّ نيّته“ یعنی حاجی اگر مکہ میں (ذوالحجۃ) کے دس دنوں میں آیا، تو اس کی (اقامت والی) نیت درست نہیں۔ تو اس پر امام اہلسنت سیدی اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ جد الممتار میں لکھتے ہیں: ”اما لو دخل لثمان بقين من ذي القعدة أو أكثر ولم ينو الخروج من مكّة للمبيت بموضعٍ آخر غير منى ومزدلفة فلا

1...(فتح القدیر، جلد 2، صفحہ 37، دار الفکر، بیروت)

2...(غنیہ، جلد 1، صفحہ 465، مکتبہ کوئٹہ)

شكّ أنّه يصير مقيماً ويتمّ" ترجمہ: بہر حال اگر کوئی حج کے لیے آنے والا (مکہ میں) اس وقت داخل ہوا جب ذیقعدہ کے آٹھ دن یا زیادہ دن باقی تھے اور مکہ سے منی و مزدلفہ کے علاوہ کہیں رات گزارنے کے لیے جانے کی نیت بھی نہیں ہے تو شک نہیں یہ شخص مقیم ہو جائے گا اور پوری نماز ادا کرے گا۔[1]

یہاں امام اہل سنت علیہ الرحمۃ نے اسی حاجی کو مقیم بیان فرمایا ہے، جو مکہ میں اس وقت داخل ہو جب ذیقعدہ کے آٹھ یا زیادہ دن باقی ہوں، اس سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ اس سے کم والا شخص یعنی جو 23 تاریخ یا اس کے بعد پہنچے گا وہ مقیم نہیں ہو گا۔

واللہ اعلم عزوجل **ورسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

الجواب صحیح	**کتبـــــــــــــــــــــــــــــــــــــہ**
مفتی فضیل رضا عطاری	**المتخصص فی الفقہ الاسلامی**
	محمد ساجد عطاری
	16 شوال المکرم 1438ھ/11 جولائی 2017ء

فتوی 54:

حاجی پر عید کی قربانی واجب ہے یا نہیں؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ میں اور میری زوجہ پاکستان سے حج کے لیے جارہے ہیں، ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ کیا ہمیں پاکستان میں عید کی قربانی کرنا ہو گی؟ یا عید کی قربانی ہم سے معاف ہو جائے گی؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

1...(جد الممتار، جلد 3، صفحہ 565، مکتبۃ المدینہ)

حج اور عید الاضحیٰ کی قربانی دو الگ الگ عبادتیں ہیں، دونوں کے اپنے احکام اور شرائط ہیں۔ عید کی قربانی مقیم صاحبِ نصاب بالغ شخص پر واجب ہوتی ہے، مسافر اور ایسے شخص پر جو صاحبِ نصاب نہ ہو، عید کی قربانی واجب نہیں ہوتی، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر آپ اور آپ کی زوجہ قربانی کے ایام (10، 11، 12 ذوالحجۃ الحرام) میں مسافر ہوں، تو قربانی کی شرائط پوری نہ ہونے کے سبب آپ لوگوں پر عید کی قربانی لازم نہیں ہوگی، اور اگر آپ لوگ قربانی کے ایام میں مسافر نہ ہوں، بلکہ مقیم ہوں اور ساتھ ہی آپ دونوں یا کوئی ایک صاحبِ نصاب بھی ہو، تو دیگر شرائط کے ساتھ جو بھی صاحب نصاب ہو، اس پر عید کی قربانی لازم ہوگی۔

واضح رہے کہ اگر کوئی شخص حج قِران یا تمتع کر رہا ہو، تو اس پر قربانی واجب ہونے کی صورت میں عید کی واجب قربانی کے علاوہ، حج کی قربانی بھی الگ سے واجب ہوگی، جو اُسے حدود حرم میں کرنا ہوگی، البتہ عید کی قربانی حاجی کو مکہ مکرمہ میں ہی کرنا ضروری نہیں، بلکہ یہ قربانی وہ اپنے وطن میں بھی کروا سکتا ہے، مگر اِس میں یہ خیال رکھنا ہوگا کہ دونوں جگہ قربانی کے ایام موجود ہوں یعنی مکہ مکرمہ میں بھی جہاں خود حاجی موجود ہے اور جس جگہ حاجی کی قربانی ہونی ہے، وہاں بھی قربانی کے ایام ہوں۔

حاجی کو کیسے یہ معلوم ہو کہ وہ ایام قربانی میں مسافر ہے یا مقیم؟ تو اس کے متعلق اصول یہ ہے کہ اگر حاجی منیٰ جانے سے پہلے مکہ مکرمہ میں پندرہ دن یا اس سے زیادہ کے لیے ٹھہرا ہو، یا اگر منیٰ جانے سے پہلے مکہ مکرمہ میں پندرہ دن کے لیے قیام نہ کیا ہو، مگر 12 ذوالحجہ کی رمی کے بعد غروب آفتاب سے پہلے پہلے وہ مقیم ہو جائے، اس طرح کہ غروب آفتاب سے پہلے پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت سے وہ عزیزیہ یا مکہ مکرمہ آجائے، تو ان دونوں صورتوں میں حاجی ایام قربانی میں

مقیم کہلائے گا، قربانی کی شرائط پائے جانے کی صورت میں اُس پر عید کی قربانی واجب ہو گی، لیکن اگر حاجی نے نہ تو منیٰ جانے سے پہلے مکہ مکرمہ میں پندرہ دن یا اس سے زیادہ قیام کیا ہو اور نہ ہی وہ 12 ذوالحجہ کی غروب آفتاب سے پہلے پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت سے عزیزیہ یا مکہ مکرمہ آئے، تو ایسی صورت میں حاجی ایامِ قربانی میں مقیم نہیں کہلائے گا، بلکہ مسافر ہو گا اور اُس پر عید کی قربانی واجب نہیں ہو گی، ہاں اگر نفلی قربانی کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، اِس پر اُسے ثواب حاصل ہو گا۔

قارن اور متمتع پر حج کی قربانی شکرانہ کے طور پر واجب ہے، چنانچہ لباب المناسک اور اس کی شرح میں ہے: "(یجب)أی اجماعا (علی القارن والمتمتع هدی شکرا لما وفقه الله تبارک و تعالی للجمع بین النسکین فی اشهر الحج بسفر واحد)" ترجمہ: قارن اور متمتع پر قربانی اجماعاً واجب ہے، اس شکرانہ میں کہ اللہ تعالی نے اسے ایک ہی سفر میں اشہرحج کے اندر دونوں عبادتوں کو جمع کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔[1]

صدر الشریعہ مفتی امجد علی اعظمی علیہ رحمۃ اللہ القوی بہار شریعت میں فرماتے ہیں:

"یہ (حج کی) قربانی وہ نہیں جو بقر عید میں ہوا کرتی ہے کہ وہ تو مسافر پر اصلاً نہیں اور مقیم مالدار پر واجب ہے اگرچہ حج میں ہو، بلکہ یہ (قربانی) حج کا شکرانہ ہے۔ قارِن اور متمتع پر واجب اگرچہ فقیر ہو اور مُفرِد کے لیے مستحب اگرچہ غنی ہو۔"[2]

مُسافر حاجی پر بقرہ عید کی قربانی واجب نہیں، چنانچہ تنویر الابصار مع در مختار میں ہے:

"(تجب) التضحیة (علی حر مسلم مقیم موسر عن نفسه) فلا تجب علی حاج مسافر"

ترجمہ: ہر آزاد مسلمان مقیم صاحب نصاب شخص پر اپنی طرف سے قربانی کرنا واجب ہے، لہذا

1...(لباب المناسک مع شرحہ، فصل فی ھدی القارن والمتمتع، صفحہ 368، مطبوعہ مکۃ المکرمہ)

2...(بہار شریعت، جلد 1، حصہ 6، صفحہ 1140، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

مسافر حاجی پر قربانی واجب نہیں۔[1]

بہارِ شریعت میں ہے: ”مسافر پر اگرچہ (قربانی) واجب نہیں مگر نفل کے طور پر کرے تو کرسکتا ہے، ثواب پائے گا۔ حج کرنے والے جو مسافر ہوں اُن پر قربانی واجب نہیں اور مقیم ہوں تو واجب ہے۔“[2]

فتاوی حج و عمرہ میں ایک سوال کے جواب میں ہے: ”سوال میں مذکور شخص اور اس کی والدہ کو چاہیے کہ وہ اپنی حالت پر غور کرلیں کہ آیا انہوں نے حج قران یا حج تمتع کیا ہے، اگر کیا ہے تو اُن پر دم شکر دینا لازم ہے۔۔۔ اس کے علاوہ یہ دونوں اس بات پر بھی توجہ کریں کہ آیا ان میں بقر عید میں کی جانے والی قربانی کی شرائط ایام قربانی میں پائی جارہی ہیں یا نہیں؟ اگر پائی جارہی ہیں تو ان پر یہ قربانی کرنا بھی واجب ہے، اگرچہ وہ اپنے اہل خانہ کے ذریعے یہ قربانی اپنی جانب سے کروالیں، جبکہ اور کوئی مانع شرعی نہ ہو۔“

”صاحب نصاب کہ جس میں قربانی کی دیگر شرائط پائی جائیں وہ عید الاضحیٰ کی قربانی مکہ مکرمہ میں بھی کرسکتا ہے اور اپنے وطن میں بھی کرواسکتا ہے، لیکن دم شکر ہو یا دم جبر اس کے جانور کا سرزمین حرم پر ذبح ہونا لازم ہے۔“[3]

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبــــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

01 ذی القعدۃ الحرام 1445ھ/10 مئی 2024ء

1...(تنویر الابصار مع درمختار، جلد 9، صفحہ 524-523، دار المعرفہ، بیروت)

2...(بہار شریعت، جلد 3، حصہ 15، صفحہ 332، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

3...(فتاوی حج وعمرہ، حصہ 13، صفحہ 67، جمعیت اشاعت اہلسنت، کراچی)

فتوی55:

حج کی قربانی منیٰ کی بجائے مکہ میں کی، تو کیا حکم ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر حاجی دس ذوالحجہ کو حج کی قربانی کا جانور مقامِ منیٰ کے بجائے مکہ مکرمہ میں ذبح کرے، تو کیا اس کی قربانی ادا ہو جائے گی یا اسے دوبارہ قربانی کا جانور ذبح کرنا ہو گا؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

حج کی قربانی کے جانور کو حدودِ حرم میں ذبح کرنا، ضروری ہوتا ہے اور مکہ مکرمہ حدودِ حرم میں شامل ہے، اس لیے اگر حاجی مکہ مکرمہ میں حج کی قربانی کا جانور ذبح کرے گا، تو حج کی قربانی ادا ہو جائے گی، لیکن دس ذوالحجہ کو حج کی قربانی مکہ میں ذبح کرنا خلافِ سنت ہے، کیونکہ حج کی قربانی کو ایامِ نحر میں منیٰ میں ذبح کرنا سنت ہے۔

درر الحکام میں ہے: "تعين الحرم للكل من الهدايا أي فلا تجزيه لو ذبحها في غيره سواء كان تطوعا أو غيره يعني إلا ما عطب من هدي التطوع فيذبحه في محل عطبه كما تقدم ويجوز الذبح في أي موضع شاء من الحرم ولا يختص بمنى" ترجمہ: تمام قسم کے حج کی قربانی کے لیے حدودِ حرم متعین ہے یعنی اگر وہ حرم کے علاوہ کہیں قربانی کے جانور کو ذبح کرے گا، تو یہ کفایت نہیں کرے گی، خواہ قربانی نفل ہو یا اس کے علاوہ۔ البتہ نفلی ھدی جو ہلاک ہونے کے قریب ہو، تو اسے اسی مقام پر ذبح کر دیا جائے گا جیسا کہ پہلے گزرا۔ اور حج کی قربانی کو حرم میں کسی بھی جگہ ذبح کرنا، جائز ہے، یہ منیٰ کے ساتھ خاص نہیں ہے۔[1]

---

[1]... (درر الحکام، جلد01، صفحہ263، مطبوعہ دار احیاء الکتب العربیہ)

درمختار میں ہے:"ویتعین الحرم لا منی "ترجمہ:اوران تمام قربانیوں کے لیے حرم متعین ہے نہ کہ منی۔

درمختار کی عبارت (لا منی) کے تحت ردالمحتار میں ہے:"بل یسن لمافی المبسوط،من ان السنۃ فی الھدایاأیام النحرمنی،وفی غیرأیام النحرفمکۃ"ترجمہ:بلکہ منیٰ میں سنت ہے،اس وجہ سے جو مبسوط میں ہے کہ ایام نحر میں قربانی میں سنت منیٰ ہے،اور ایام نحر کے علاوہ میں مکہ ہے۔[1]

بہار شریعت میں ہے:" اس قربانی کے لیے یہ ضرور ہے کہ حرم میں ہو، بیرون حرم نہیں ہو سکتی اور سنت یہ کہ منیٰ میں ہو۔"[2]

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــہ

مفتی ابو الحسن محمد ھاشم خان عطاری

18ذو الحجۃ الحرام1443ھ/18جولائی2022ء

فتوی56:

عمرہ کے لیے قرعہ اندازی میں جوئے کی صورت

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں ایک کمیٹی بنی ہوئی ہے، وہ ربیع الاول میں لوگوں سے فی کس ایک ہزار روپے جمع کرتی ہے، جو افراد رقم دیتے ہیں، ان کا نام قرعہ اندازی میں شامل کیا جاتا ہے، پھر قرعہ اندازی میں جس

1...(درمختارمعہ ردالمحتار،جلد04،صفحہ47،مطبوعہ کوئٹہ)

2...(بہارشریعت،جلد01،صفحہ1156،مطبوعہ مکتبۃ المدینہ،کراچی)

ایک شخص کا نام نکلتا ہے، اسے عمرے پر بھیج دیا جاتا ہے اور بقیہ افراد کو کچھ نہیں ملتا، تو برائے کرم اس طریقہ کار کے متعلق شرعی رہنمائی فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

عمرہ کرنا اور عمرہ کے لیے کسی کے ساتھ تعاون کرنا بلاشبہ نہایت عمدہ اور مستحسن عمل ہے، عمرہ کے فضائل سے احادیث طیبہ مالا مال ہیں، یونہی نیکی کے کام میں تعاون کرنے کی ترغیب قرآن کریم میں موجود ہے، لیکن یاد رہے کہ ہم نیکی کے کام میں جائز تعاون ہی کر سکتے ہیں۔ کئی کمیٹیاں عمرہ کا شوق رکھنے والے افراد کے لیے مختلف اسکیمز نکالتی رہتی ہیں، یہ اگرچہ اچھی نیت کے ساتھ ہو، لیکن ضروری ہے کہ وہ اسکیم اسلام کے مطابق بھی ہو، جبکہ **سوال میں ذکر کردہ اسکیم قرآن و حدیث کے خلاف اور جوئے پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز و حرام ہے۔** نیز اس کی خرابیوں میں سے یہ بھی ہے کہ **جوئے کے ذریعے جو مال ملے گا، وہ لینا حرام** اور **دوسروں کا مال باطل طریقے سے کھانا** کہلاتا ہے۔ پھر **مالِ حرام سے کیا جانے والا عمرہ بھی اللہ عزوجل کی پاک بارگاہ میں قبول نہیں ہوتا۔** لہذا بحیثیتِ مسلمان اس اسکیم سے بچنا شرعاً لازم ہے۔ نیز اس اسکیم کی سرپرستی کرنے والوں کو بھی حکمتِ عملی سے شرعی حکم بتاتے ہوئے یہ اسکیم ختم کرنے کی ترغیب دلائیں، بلکہ انہیں خود بھی چاہیے کہ اس شیطانی عمل سے بچیں اور اپنی آخرت داؤ پر نہ لگائیں۔

اس اسکیم کے جوئے پر مشتمل ہونے کی تفصیل یہ ہے کہ جو افراد اس اسکیم میں رقم جمع کروائیں گے، انہی کا نام قرعہ اندازی میں شامل کیا جائے گا، پھر جس کا نام نکل آیا، اس کے لیے جمع شدہ رقم سے عمرہ کا انتظام کر دیا جائے گا اور بقیہ جن کا نام نہیں نکلا، ان کی رقم ضائع چلی جائے گی اور جوا کی تعریف بھی یہی ہے کہ اپنے مال کو اس طرح خطرہ پر ڈالنا کہ یا تو زائد مال مل جائے یا اپنا

مال بھی چلا جائے۔

جزئیات درج ذیل ہیں:

جوا کی تعریف معجم لغۃ الفقهاء میں کچھ یوں منقول ہے: ”تعليق الملك على الخطر والمال من الجانبين“ ترجمہ: اپنی ملکیت کو خطرے میں ڈالنا، اس حال میں کہ مال دونوں طرف سے ہو۔[1]

اور محیطِ برہانی میں ہے: ”القمار مشتق من القمر الذی یزداد وینقص، سمي القمار قماراً لان کل واحد من المقامرین ممن یجوز ان یذهب ماله الی صاحبه ویستفید مال صاحبه، فیزداد مال کل واحد منهما مرة وینتقص اخری، فاذا کان المال مشروطاً من الجانبین کان قماراً والقمار حرام ولان فیه تعلیق تملیك المال بالخطر وانه لا یجوز“ ترجمہ: لفظ ”قمار“ ”قمر“ سے بنا ہے جو گھٹتا اور بڑھتا رہتا ہے اور قمار کو قمار اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں بھی بازی لگانے والوں میں سے ہر ایک کا مال دوسرے کے پاس جانا، ممکن ہوتا ہے اور وہ مدِ مقابل کے مال سے نفع حاصل کرلیتا ہے، پس اس طرح ان میں سے ہر ایک کا مال بھی کبھی گھٹتا ہے اور کبھی بڑھتا ہے، پس جب مال جانبین سے مشروط ہو، تو یہ قمار ہو گا اور قمار حرام ہے، اس لیے کہ اس میں اپنے مال کو خطرے پر پیش کرنا ہے اور یہ جائز نہیں۔[2]

جوئے کو ”مَیْسِر“ بھی کہتے ہیں اور اس کی مذمت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ

1...(معجم لغۃ الفقهاء، صفحہ 369، مطبوعہ دار النفائس)

2...(محیط برهانی، کتاب الکراهیة، جلد 6، صفحہ 54، مطبوعہ کوئٹہ)

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ترجمہ کنز العرفان:"اے ایمان والو!شراب اور جوا اور بت اور قسمت معلوم کرنے کے تیر ناپاک شیطانی کام ہی ہیں،تو ان سے بچتے رہو کہ تم فلاح پاؤ۔"[1]

مزید فرماتا ہے:﴿اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ وَ یَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِۚ-فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴾ترجمہ کنزالعرفان:"شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی اور بغض و کینہ ڈال دے اور تمہیں اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے،تو کیا تم باز آئے ہو؟۔"[2]

نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:"ان اللہ حرم علیکم الخمر والمیسر والکوبۃ وقال کل مسکر حرام"ترجمہ:اللہ تعالیٰ نے شراب اور جوا اور کوبہ(ڈھول)حرام کیا اور فرمایا:ہر نشے والی چیز حرام ہے۔[3]

جوئے سے حاصل کردہ مال دوسرے کا مال باطل طریقے سے کھانا ہے اور اس کے متعلق اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے:﴿وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ترجمہ کنز الایمان:"اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ۔"[4]

اس آیت کے تحت تفسیر قرطبی میں ہے:"والمعنی:لا یاکل بعضکم مال اخیہ بغیر حق،فیدخل فی ھذا:القمار والخداع والغصوب۔۔وغیر ذلک"ترجمہ:اور(اس آیت کا) معنی یہ ہے کہ تم میں سے کوئی بھی دوسرے کا مال ناحق طریقے سے نہ کھائے،اس عموم میں جوا،

1...(پارہ7،سورۃالمائدہ،آیت90)

2...(پارہ7،سورۃالمائدہ،آیت91)

3...(سنن الکبریٰ للبیھقی،جلد10،صفحہ360،مطبوعہ بیروت)

4...(پارہ2،سورۃالبقرہ،آیت188)

دھوکا دہی، غصب۔۔۔وغیرہ سب داخل ہیں۔[1]

ایسی اسکیم کے متعلق وقار الفتاوی میں ہے: "ایسی کوئی لاٹری جائز نہیں، جس میں قرعہ اندازی کرنے سے اگر کسی ممبر کا نام نہ نکلے، تو اس کا اپنا روپیہ ختم ہو جائے گا اور جس کا نام نکلا وہ دوسروں کا روپیہ حاصل کر لے، یہ جوا ہے۔"[2]

جوئے سے حاصل شدہ مال حرام ہے۔ فتاوی رضویہ میں ہے: "سود اور چوری اور غصب اور جوئے کا روپیہ قطعی حرام ہے۔"[3]

اور مالِ حرام سے کیا جانے والا عمرہ قبول نہ ہو گا۔ "بغیۃ الباحث عن زوائد مسند الحارث" میں ہے: "ومن كسب مالا حراما لم تقبل له صدقة ولا عتق ولا حج ولا عمرة" ترجمہ: جس نے مال حرام کمایا اللہ عزوجل نہ اس کا صدقہ قبول فرمائے گا، نہ غلام آزاد کرنا، نہ حج کرنا اور نہ ہی عمرہ کرنا۔[4]

واللہ اعلم عزوجل **و رسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

07ربیع الاول1444ھ/04اکتوبر2022ء

1...(تفسیر قرطبی، جلد2، صفحہ338، مطبوعہ دار الکتب، القاھرہ)

2...(وقار الفتاوی، جلد3، صفحہ310، مطبوعہ کراچی)

3...(فتاوی رضویہ، جلد19، صفحہ646، رضا فاؤنڈیشن، لاھور)

4...(بغیۃ الباحث عن زوائد مسند الحارث، جلد1، صفحہ309، مطبوعہ المدینۃ المنورہ)

فتوی 57:

حالتِ احرام میں ستر عورت کھل جائے تو کیا حکم ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر احرام کی حالت میں کسی عورت کے بال پیشانی پر ظاہر ہو جائیں، یونہی اگر عورت نے آدھی آستین والی قمیص پہنی ہو تو احرام کی حالت میں اس کی کلائیاں نظر آئیں، تو ایسی صورت میں کیا عورت پر کوئی کفارہ یعنی دم یا صدقہ لازم ہو گا یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

سوائے چہرے اور کلائیوں گٹّوں کے نیچے تک ہاتھوں اور ٹخنے سے نیچے تک پاؤں کے، عورت کا تمام جسم ہی ستر عورت (یعنی چھپانے کی چیز) ہے یہاں تک کہ سر سے لٹکتے ہوئے بال بھی۔ عورت کے لئے عام حالات میں بھی اپنے اعضائے ستر کو چھپانا لازم ہے، چاہے وہ احرام کی حالت میں ہو، یا بغیر احرام کے، بہر حال اجنبی مَردوں سے اُن اعضا کا پردہ کرنا لازم ہے، اور اعضائے مستورہ کے کھلے ہونے کی حالت میں اجنبی مردوں کے سامنے آنا شرعاً ناجائز اور گناہ کا کام ہے، لہذا عورت کو چاہئے کہ ایسا لباس پہنے جس سے اس کے اعضائے مستورہ ظاہر نہ ہوں، ورنہ اسی حالت میں اگر اجنبی مردوں کے سامنے آئے گی، تو گناہگار ہو گی، البتہ احرام کی حالت میں اگر عورت کے بال، کلائیاں وغیرہ کوئی اعضائے ستر ظاہر ہو جائیں، تو اس کی وجہ سے عورت پر کوئی کفارہ وغیرہ لازم نہیں ہو گا، ہاں جس طرح نماز میں مرد کو اپنا ستر اور عورت کو سوائے چند اعضا کے اپنا تمام جسم چھپانا فرض ہوتا ہے، اسی طرح طواف میں بھی مرد و عورت کیلئے اپنے اعضائے مستورہ کو چھپانا واجب ہوتا ہے، جس کی خلاف ورزی پر اگرچہ طواف ہو جائے

گا، مگر ترکِ واجب کی وجہ سے بعض صورتوں میں صدقہ اور بعض صورتوں میں دَم دینا لازم ہوتا ہے، جس کی تفصیل کتبِ مناسک میں موجود ہے، لہٰذا اگر طواف میں عورت کے اعضائے مستورہ میں سے کوئی عضو کھلا ہو، تو پھر کفارے کی صورتیں ہو سکتی ہیں، ورنہ عام حالت میں اس پر کوئی کفارہ وغیرہ نہیں۔

عورت کے چند اعضاء کے علاوہ پورا جسم ہی ستر عورت میں داخل ہے، چنانچہ تنویر الابصار مع در مختار میں ہے:"الرابع (ستر عورته وهی للرجل ماتحت سرته الی ماتحت رکبته... وللحرة جمیع بدنهاحتی شعرها النازل فی الاصح خلا الوجه والکفین والقدمین ملتقطاً"ترجمہ: چوتھی شرط اس کے ستر کا چھپا ہونا ہے۔ اور مرد کا ستر عورت ناف سے کر گھٹنے کے نیچے تک ہے اور آزاد عورت کا تمام جسم ہی ستر عورت ہے حتی کہ سر سے لٹکتے ہوئے بال بھی، سِوائے چہرے اور کلائیوں تک ہاتھوں اور ٹخنے سے نیچے تک پاؤں کے۔[1]

سیدی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان علیہ رحمۃ الرحمن فتاوی رضویہ میں ارشاد فرماتے ہیں:"بے پردہ بایں معنی کہ جن اعضاء کا چھپانا فرض ہے، ان میں سے کچھ کھلا ہو جیسے سر کے بالوں کا کچھ حصہ یا گلے یا کلائی یا پیٹ یا پنڈلی کا کوئی جز، تو اس طور پر تو عورت کو غیر محرم کے سامنے جانا مطلقاً حرام ہے۔"[2]

مرد و عورت میں سے ہر ایک کے لیے طواف میں ستر عورت واجب ہے، چنانچہ "لباب المناسك" اور اس کی شرح میں ہے:"(الثالث) ای من الواجبات (ستر العورة فلو طاف مکشوفاً) قدر ما لا تجوز الصلاة معه (وجب الدم) أی ان لم یعده (والمانع) أی قدره (کشف

1...(تنویر الابصار مع درمختار، جلد 2، کتاب الصلاۃ، مطلب فی ستر العورۃ، صفحہ 93-96، دار المعرفہ، بیروت)

2...(فتاویٰ رضویہ، جلد 22، صفحہ 240، رضا فاؤنڈیشن، لاھور)

ربع العضو)أی من اعضاالعورۃ(کما فی الصلاۃ و إن انکشف أقل من ربع لا یمنع و یجمع المتفرق)"ترجمہ:طواف کا تیسرا واجب ستر عورت ہے،اگر کسی عضو (مستورہ)کے اتنی مقدار میں کھلے ہونے کی حالت میں طواف کیا، جتنی مقدار کے ساتھ نماز جائز نہیں ہوتی،تو دم واجب ہو گا یعنی اگر اعادہ نہیں کیا،اور بقدر مانع تو وہ اعضائے مستورہ کا چوتھائی عضو ہے،جیسا کہ نماز میں ہوتا ہے،اور اگر چوتھائی سے کم عضو کھل گیا تو وہ مانع نہیں ہو گا،اور متفرق (یعنی ایک سے زائد اعضا کے کھلنے پر سب)کو جمع کیا جائے گا۔[1]

تنویر الابصار مع در مختار میں ہے:"(وستر العورۃ) فیہ وبکشف ربع العضو فأکثر کما فی الصلاۃ یجب الدم"ترجمہ:اور طواف میں ستر عورت واجب ہے،تو عضو کی چوتھائی یا اس سے زائد کھلنے پر دم واجب ہو گا۔

اس کے تحت رد المحتار میں ہے:"أی:إن لم یعدہ وإلّا سقط وھذافی الطواف الواجب وإلّا تجب الصدقۃ"ترجمہ:یعنی اگر اس طواف کا اعادہ نہیں کیا تو،ورنہ دم ساقط ہو جائے گا،اور یہ واجب (اور فرض)طواف میں ہے،ورنہ (اگر فرض یا واجب طواف نہ ہو تو)صدقہ واجب ہو گا۔[2]

حج کے واجبات کی منفرد اور عمدہ کتاب بنام "27 واجباتِ حج" میں ہے:"ویسے تو عام حالات میں سِترِ عورت لازمی ہے اور نماز میں بھی مرد و عورت کے لئے اپنی اپنی تفصیل کے مطابق سِترِ عورت فرض ہے کہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہو گی۔البتہ طواف کے دوران سِترِ عورت

1...(لباب المناسک مع شرحہ،فصل فی واجبات الطواف،صفحہ214،مطبوعہ مکۃ المکرمۃ)

2...(تنویر الابصار مع درمختار وردالمحتار،کتاب الحج،جلد3،صفحہ540-541،دار المعرفۃ،بیروت)

صرف واجب ہے یعنی سِترِ عورت کی کوتاہی پر طواف ہو تو جائے گا مگر بعض صورتوں میں صدقہ اور بعض صورتوں میں دَم دینا لازم ہو گا۔ اگر جان بوجھ کر ہو تو توبہ بھی کرنی ہو گی۔"[1]

واللہ اعلم عزوجل **ورسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــه

مفتی محمد قاسم عطاری

13 صفر المظفر 1446ھ/19 اگست 2024

فتویٰ 58:

ہاتھ کی بجائے غُلیل سے رمی کرنے کا حکم؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کسی شخص نے غُلیل (ایک چھوٹا سا آلہ جس سے پتھر پھینکا جاتا ہے) سے رمی کی، تو اس کے ذریعے کی جانے والی رمی کافی ہو گی یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق والصواب

غُلیل (ایک چھوٹا سا آلہ جس سے کنکری پھینکی جاتی ہے) کے ذریعے کی جانے والی رمی ہر گز کافی نہیں ہو گی، کیونکہ رمی کے صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے کہ رمی براہ راست ہاتھ کے ذریعے کی جائے۔ غُلیل، یا کنکری، پتھر پھینکنے والے کسی بھی آلہ سے رمی میں چونکہ براہ راست ہاتھ سے رمی کرنا نہیں پایا جاتا، لہذا اس طرح کسی آلہ وغیرہ کے ذریعے کی جانے والی رمی نہیں ہو گی۔ واضح رہے کہ ہاتھ سے رمی کرنے میں کسی خاص طریقے کی کوئی قید نہیں، بلکہ ہاتھ سے کی

1...(27 واجبات حج اور تفصیلی احکام، صفحہ 142، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

جانے والی رمی کسی بھی طریقے سے ہو، شرعاً جائز و درست ہے، البتہ ہاتھ سے رمی کرنے میں مستحب و بہتر طریقہ یہ ہے کہ کنکری کو سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے پکڑ کر، سیدھا ہاتھ خوب اٹھا کر کہ بغل کی رنگت ظاہر ہو، جمرات کی رمی کی جائے، یہ طریقہ آسان بھی ہے اور عام طور پر اسی انداز میں ہی رمی کی جاتی ہے۔

علامہ زین الدین ابن نجیم مصری حنفی رحمۃ اللہ علیہ بحر الرائق شرح کنز الدقائق میں اور علامہ ابو البقاء محمد بن احمد ضیاء مکی حنفی رحمۃ اللہ علیہ "بحر العمیق" میں ارشاد فرماتے ہیں: واللفظ للعمیق: "ولا یجزئ الرمی عن القوس وشبهه، ولا الدفع برجل" ترجمہ: اور کمان اور اس کی مثل کسی چیز سے رمی کافی نہیں، اور پاؤں سے پتھر پھینک کر کی جانے والی رمی بھی کافی نہیں ہو گی۔[1]

رمی براہ راست ہاتھ سے ضروری ہے، غُلیل آلہ سے کی جانے والی رمی کافی نہیں ہو گی

، جیسا کہ الفقہ الاسلامی وادلتہ للزحیلی میں ہے: "یشترط لصحة الرمی۔۔۔أن یکون الرمي بید ۔۔۔فلا یکفي الرمي بقوس، ولا الرمي بالرجل **ولا بالمقلاع**" ملتقطاً ترجمہ: رمی کے صحیح ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ رمی ہاتھ سے ہو۔۔۔، لہذا کمان سے رمی کافی نہ ہو گی، اور یونہی پاؤں سے اور غُلیل سے بھی رمی کافی نہیں ہو گی۔[2]

ہاتھ سے کی جانے والی رمی کسی بھی طریقے سے ہو، شرعاً جائز ہے، جیسا کہ محیط برہانی میں ہے: "واختار مشائخ بخاری أنه کیفما رمی فهو جائز؛ لأن المنصوص علیه في الأحادیث

1۔۔۔(البحر العمیق، الباب الثانی عشر: فی الاعمال المشروعة یوم النحر، صفحہ 1672، مؤسسة الریان)

2۔۔۔(الفقہ الاسلامی وادلتہ، جلد 3، المطلب الثاني: رمي الجمار، صفحہ 2257، دار الفکر، دمشق)

الرمي، فبأي طريق أتى بالرمي، فقد أتى بالمنصوص، فيجوز"ترجمہ: اور مشائخ بخاری کا مختار یہ ہے کہ رمی کرنے والا کسی بھی طرح رمی کرے، تو یہ جائز ہے، کیونکہ احادیث میں منصوص رمی (کنکری مارنا) ہے، تو جس طریقے سے بھی کنکری مارے گا، منصوص حکم پر عمل ہو جائے گا، لہذا رمی کرنا، جائز ہو جائے گا۔[1]

رمی کے مستحب طریقے سے متعلق لباب المناسک اور اس کی شرح میں ہے: "(کیفیة الرمی) أی المستحبة۔۔۔ (قیل یأخذ بطرفی ابھامه وسبابته وھو الاصح) لانه الایسر والمعتاد عند الاکثر (وھذا بیان الاولوية، وأما الجواز فلا يتقيد بهيئة بل يجوز كيفما كان)۔۔۔ (ويستحب الرمى باليمنى ويرفع يده حتى يرى بياض ابطه)" ملتقطاً۔ ترجمہ: رمی کا مستحب طریقہ، تو کہا گیا ہے کہ (وہ طریقہ یہ ہے کہ رمی کرنے والا) کنکری کو اپنے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے دونوں کناروں سے پکڑے اور یہی زیادہ صحیح ہے، کیونکہ یہ زیادہ آسان ہے اور اکثر کے نزدیک یہی معتاد ہے، اور یہ صرف اولویت یعنی بہتر طریقے کا بیان ہے، اور بہر حال جواز تو وہ کسی طریقے کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہاتھ سے جس طرح بھی رمی ہو، جائز ہے۔۔۔ اور سیدھے ہاتھ سے رمی کرنا مستحب ہے اور یہ کہ رمی کرنے والا ہاتھ کو اٹھائے یہاں تک کہ اس کی بغل کی سفیدی دکھائی دے۔[2]

صدر الشریعہ مفتی امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ بہار شریعت میں لکھتے ہیں: "سات کنکریاں جدا جدا چٹکی میں لے کر سیدھا ہاتھ خوب اُٹھا کر کہ بغل کی رنگت ظاہر ہو (رمی کرو)۔"[3]

1...(المحیط البرھانی، جلد2، صفحہ430، دار الکتب العلمیہ، بیروت)

2...(لباب المناسک مع شرحہ، باب مناسک منی، صفحہ316، 317، مطبوعہ مکۃ المکرمہ)

3...(بہار شریعت، جلد1، حصہ6، صفحہ1139، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبــــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

21ذی الحجۃ الحرام1445ھ/28جون2024ء

فتویٰ59:

مخصوص ایام میں حدود حرم میں داخل ہونے کا حکم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک خاتون عمرہ کے لیے ریاض سے مکہ جارہی تھی، جب وہ میقات پہنچی، تو اس کے خاص ایام شروع ہوگئے۔ اب اس حالت میں وہ حرم کی حدود میں داخل ہوسکتی ہے؟ اور اب کہ وہ اس حالت میں عمرہ نہیں کرسکے گی، تو کیا اس پر دَم لازم ہوگا یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق والصواب

ماہواری کی حالت میں بھی عورت حدود حرم میں داخل ہوسکتی ہے، مگر جبکہ وہ میقات کے باہر سے آرہی ہے، تو اسے میقات سے عمرے کے احرام کی نیت کرکے ہی حدود حرم میں داخل ہونا ہوگا، بغیر احرام کی نیت کے حدود حرم میں داخل نہیں ہوسکتی، اگر احرام کی نیت کیے بغیر میقات سے گزر جائے گی، تو اُس پر دم لازم ہوجائے گا، ہاں جب واپس میقات جاکر عمرہ یا حج کے احرام کی نیت اور تلبیہ کہہ لے گی، تو اس پر لازم ہونے والا دم ساقط ہوجائے گا، البتہ جان بوجھ کر میقات سے بغیر احرام گزرنے کی وجہ سے گنہگار ہوگی، جس سے توبہ کرنا ضروری ہوگا۔ نیز جب میقات سے عمرے کی نیت کے ساتھ حدود حرم میں داخل ہوجائے گی، تو اُسے بہر حال عمرہ ہی ادا کرنا ہوگا، دم دینا کافی نہیں ہوگا، بغیر عمرہ کے وہ احرام سے باہر نہیں آسکے گی، البتہ ماہواری کی حالت میں فی الحال عمرہ نہیں کرے گی، بلکہ عمرے کی ادائیگی کے لیے پاک ہونے کا انتظار

کرے گی، جب پاک ہو جائے گی، تو غسل کر کے عمرہ ادا کرے گی۔

حرم مکہ داخل ہونے والے کے لیے میقات سے عمرہ یا حج کے احرام کی نیت واجب ہے، چنانچہ **لباب المناسک** میں ہے:"(وحكمها وجوب الاحرام منها لاحد النسكين وتحريم تاخيره عنها لمن اراد دخول مكة أو الحرم)"**ترجمہ:** میقات کا حکم یہ ہے کہ جو شخص مکہ یا حرم میں داخل ہونے کا ارادہ کرے، اس کے لیے عمرہ یا حج میں سے کسی ایک کا احرام میقات سے باندھنا واجب ہے اور (جان بوجھ کر) احرام کو میقات سے مؤخر کرنا، حرام ہے۔[(1)]

لباب المناسک اور اس کی شرح میں ہے:"(من جاوز وقته غير محرم...فعليه العود) أی فيجب عليه الرجوع (الى وقت) أی الى ميقات من المواقيت (وان لم يعد فعليه دم...فان عاد) أی المتجاوز (سقط) أی الدم (ان لبى منه) أی من الميقات على فرض أنه احرم بعده، والا فلا بد ان ينوی ويلبی ليصير محرما حينئذ"**ترجمہ:** جو شخص بغیر احرام کی نیت کے میقات سے گزر جائے، تو اس پر کسی بھی میقات پر واپس لوٹنا واجب ہے، اور اگر واپس نہ گیا، تو اس پر دم لازم ہو گا، اور اگر واپس کسی میقات پر چلا گیا اور تلبیہ کہہ لی، تو دم ساقط ہو گیا یعنی جبکہ میقات سے گزرنے کے بعد (حرم میں ہی کسی جگہ) احرام کی نیت کر لی ہو اور اگر احرام کی نیت نہیں کی تو اب ضروری ہے کہ میقات پر جا کر نیت کرے اور تلبیہ کہے تا کہ وہ اُس وقت مُحرم ہو جائے۔[(2)]

بہار شریعت میں ہے:"میقات کو واپس جا کر احرام باندھ کر آیا، تو دَم ساقط اور مکہ معظمہ میں داخل ہونے سے جو اُس پر حج یا عمرہ واجب ہوا تھا اس کا احرام باندھا اور ادا کیا، تو بری الذّمہ

1...(لباب المناسک، فصل فی مواقی، الصنف الاول، صفحہ 88، دار الکتب العلمیہ، بیروت)

2...(لباب المناسک مع شرحہ، فصل فی مجاوزۃ المیقات بغیر احرام، صفحہ 94،95، دار الکتب العلمیہ، بیروت)

ہو گیا۔“[1]

طوافِ عمرہ کے تمام یا اکثر پھیرے کیے بغیر احرام ختم نہیں ہو گا، اور اس کا کوئی بدل نہیں، جیسا کہ علامہ ابو الحسن علاء الدین علی بن بلبان فارسی حنفی رحمۃ اللہ علیہ عمدۃ السالک فی المناسک میں لکھتے ہیں: ”لو ترک اکثر طواف العمرۃ أو کله، وسعی بین الصفا والمروۃ ورجع الی اھله فھو محرم أبداً، ولا یجزئ عنه البدل“ ترجمہ: اگر کسی نے عمرے کے طواف کے اکثر یا تمام پھیرے ترک کر دیے اور صفا مروہ کی سعی کر لی اور اپنے گھر لوٹ گیا، تو وہ ہمیشہ حالتِ احرام میں رہے گا، اور اس کے بدلے کوئی چیز کافی نہ ہو گی۔[2]

واللہ اعلم عزوجل **و رسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

16محرم الحرام1446ھ/23جولائی2024

فتوی60:

طواف کے نوافل بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ طواف کے نوافل بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

طواف کے نوافل بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں، البتہ اگر کوئی عذر نہ ہو، تو کھڑے ہو کر ہی ادا

1۔۔۔(بہار شریعت، جلد1، حصہ6، صفحہ1191، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

2۔۔۔(عمدۃ السالک فی المناسک، الباب الرابع عشر فی الجنایات، صفحہ525، دار اللباب)

کرنے چاہئیں کہ بلا عذر بیٹھ کر نوافل ادا کرنے سے کھڑے ہو کر پڑھنے کے مقابلے میں ثواب آدھارہ جاتا ہے۔

تفصیل اس مسئلے کی یہ ہے کہ طواف کی دو رکعتیں بنیادی طور پر نفل نمازہے، جسے بندہ خود پر اپنے عمل (طواف مکمل کرنے) سے واجب کرلیتا ہے، اسے "واجب لغیرہ" بھی کہتے ہیں، اسے ادا کرنا تو واجب ہوتا ہے، لیکن بعض احکام میں یہ نماز، نفل کے حکم میں ہی باقی رہتی ہے اور شرعی حکم کے مطابق نوافل میں قیام لازم نہیں، کیونکہ نفل میں قیام ایک زائد وصف ہے، اسی لیے انہیں بیٹھ کر پڑھنا بھی درست ہے، تو اگر کوئی اپنے اوپر نفل لازم کرلے، تو اس کا وصفِ زائد (قیام) از خود لازم نہیں ہو جائے گا۔ اس کی مثال منت کے نوافل ہیں، کہ اگر کوئی بندہ نفل پڑھنے کی منت مان لے، تو بیٹھ کر بھی پڑھ سکتا ہے، لہذا طواف کے نوافل بھی اگرچہ بندے نے (طواف کرنے کے سبب) اپنے اوپر لازم کرلیے ہیں، لیکن ان میں قیام کا وصف لازم نہیں ہو گا، لہذا انہیں بھی بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں۔ البتہ بلا عذر بیٹھ کر نفل پڑھنے میں کھڑے ہو کر پڑھنے کے مقابلے میں ثواب آدھارہ جاتا ہے، لہذا حتی الامکان قیام کے ساتھ ہی ادا کرنے چاہئیں، بالخصوص حرمِ پاک میں اس کا خاص خیال رکھیں کہ حرم میں ایک نیکی ایک لاکھ نیکی کے برابر ہے۔

طواف کے نوافل واجب لغیرہ ہیں اور واجب لغیرہ (بعض احکام میں) نفل سے ملحق ہوتے ہیں۔ در مختار میں ہے: ”(کل ما کان **واجباً لغیرہ**) **وھو ما یتوقف وجوبہ علی فعلہ** (کمنذور رکعتی طواف وسجدتی سھو والذی شرع فیہ ثم افسد)۔۔۔الخ“ ترجمہ: ہر واجب لغیرہ (یہ وہ نماز ہے) کہ جس کا وجوب بندے کے فعل پر موقوف ہو، جیسے منت، طواف کی

رکعات۔۔۔الخ۔[1]

تبیین الحقائق میں ہے: ”کل ما کان واجبالغیرہ کالمنذور رکعتي الطواف والذي شرع فیه، ثم أفسده ملحق بالنفل حتی لا یصلیها في هذین الوقتین“ ترجمہ: ہر واجب لغیرہ، جیسے منت اور طواف کی رکعات اور وہ نفل جسے شروع کرکے فاسد کردیا، یہ نفل سے ملحق ہے، حتی کہ اسے دو اوقات (بعد طلوعِ فجر و نماز عصر) نہیں پڑھیں گے۔[2]

نفل نماز بیٹھ کر بھی پڑھ سکتے ہیں کہ نفل میں قیام ایک زائد وصف ہے۔ ہدایہ شریف میں فرمایا: ”ویصلي النافلة قاعدا مع القدرة علی القیام۔۔وان افتتحها قائماً ثم قعد من غیر عذر جاز عند ابی حنیفة رحمه اللہ وهذا استحسان“ ترجمہ: اور قیام پر قدرت کے باوجود نفل نماز بیٹھ کر پڑھنا درست ہے۔۔۔ اور (اسی لیے) اگر نفل کھڑے ہو کر شروع کیے، پھر بغیر کسی عذر کے بیٹھ گیا، تو امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک جائز ہے اور یہ استحسان ہے۔[3]

اسی لیے منت کے نوافل میں قیام از خود لازم نہیں ہو گا۔ برہان الاسلام امام رضی الدین محمد بن محمد سرخسی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: ”لو نذر ان یصلی مطلقاً لم یلزمه القیام وهو الصحیح، **لان القیام زیادۃ صفة فی التطوع فلا یلتزم الا بالشرط**“ ترجمہ: اگر کسی نے مطلق نماز کی منت مانی تو اس پر قیام لازم نہیں، یہی صحیح قول ہے، کیونکہ **قیام نفل نماز میں ایک زائد وصف ہے، لہٰذا بغیر شرط کیے لازم نہیں ہو گا۔**[4]

1۔۔۔(ملتقطاً از در مختار، کتاب الصلوۃ، جلد2، صفحہ44، مطبوعہ پشاور)

2۔۔۔(تبیین الحقائق، کتاب الصلوۃ، جلد1، صفحہ87، مطبوعہ ملتان)

3۔۔۔(الهدایة، کتاب الصلوۃ، جلد1، صفحہ156، مطبوعہ لاہور)

4۔۔۔(المحیط الرضوی، کتاب الصلوۃ، جلد1، صفحہ271، دار الکتب العلمیة، بیروت)

علامہ محقق شیخ ابراہیم حلبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اذا نذر ولم یلتزم فی نذرہ صفة القیام وقال فی الکافی: لم یلزمہ القیام فی الصحیح، **لان القیام وراء ما یتم بہ التطوع**، فلا یلزمہ الا بالتنصیص علیہ" ترجمہ: جب کسی شخص نے نماز کی منت مانی اور اس میں قیام کو ذکر نہیں کیا، کافی میں ہے: صحیح قول کے مطابق قیام لازم نہیں ہو گا، کیونکہ **نفل نماز کی تکمیل میں جو چیزیں لازم ہیں، ان میں قیام ایک اضافی چیز ہے** اور یہ نفل میں تب ہی لازم ہو گا جب اس کی صراحت مذکور ہو۔[1]

نفل نماز کھڑے ہو کر پڑھنا افضل ہے، بلا عذر بیٹھ کر پڑھنے سے ثواب آدھا رہ جاتا ہے۔ حضرت سیدنا ابن بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، مجھے حضرت عمران بن حصین (رضی اللہ عنہ) نے بیان کیا کہ: "سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن صلاۃ الرجل قاعدا، فقال: إن صلی قائما فھو أفضل ومن صلی قاعدا، فلہ نصف أجر القائم" ترجمہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم سے آدمی کے بیٹھ کر (نفل) نماز پڑھنے کے بارے میں دریافت کیا، تو آپ صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھے تو افضل ہے، اور جس نے بیٹھ کر نماز پڑھی اسے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کی بنسبت آدھا ثواب ملے گا۔[2]

علامہ حسن بن عمار شرنبلالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "یجوز النفل قاعدا مع القدرة علی القیام لکن لہ نصف أجر القائم إلا من عذر" ترجمہ: **قیام پر قدرت کے باوجود بیٹھ کر نوافل ادا کرنا، جائز ہے، لیکن بیٹھ کر نوافل ادا کرنے والے کو، کھڑے ہو کر نوافل ادا کرنے والے کی بنسبت**

1...(غنیۃ المتملی، فصل فی النوافل، صفحہ 396، مطبوعہ کوئٹہ)

2...(صحیح البخاری، ابواب تقصیر الصلاۃ، جلد 1، صفحہ 150، مطبوعہ کراچی)

آدھا ثواب ملے گا، مگر کوئی عذر ہو (تو بیٹھ کر بھی نوافل ادا کرنے میں مکمل ثواب ملے گا)۔ [1]

حرم میں ایک نیکی ایک لاکھ نیکی کے برابر ہے۔ سنن ابن ماجہ میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”من أدرك رمضان بمكة فصامه وقام منه ما تيسر له، كتب الله له مائة ألف شهر رمضان فيما سواها“ ترجمہ: جس نے مکہ مکرمہ میں ماہِ رمضان پایا اور اُس کے روزے رکھے اور جتنا میسر آیا، قیام کیا، تو اللہ تعالیٰ اُس کے لیے مکہ کے علاوہ کسی اور مقام پر ایک لاکھ رمضان کے مہینوں کے برابر ثواب عطا فرمائے گا۔ [2]

و اللہ اعلم عزوجل **و رسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبــــــــــــــــــــــــہ	الجواب صحیح
المتخصص فی الفقہ الاسلامی	مفتی محمد قاسم عطاری
ابو تراب محمد علی عطاری	
28 رجب المرجب 1446ھ 29 جنوری 2025ء	

فتوی 61:

ذوالحجہ کے 10 دنوں میں بال ناخن وغیرہ کاٹنے کا حکم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ

(1) جس پر قربانی واجب ہو، کیا اسے قربانی تک بال اور ناخن نہ کاٹنا ضروری ہیں؟

(2) اور جس پر قربانی واجب نہیں، اس کے لیے کیا حکم ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللّٰھم ھدایۃ الحق و الصواب

1...(نور الایضاح، کتاب الصلاۃ، فصل فی الصلاۃ جالسا الخ، ص 81، المکتبۃ العصریۃ)

2...(سنن ابن ماجۃ، کتاب المناسک، باب صوم شہر رمضان بمکہ، صفحہ 225، مطبوعہ کراچی)

(1) جس نے قربانی کرنی ہو، حدیثِ پاک میں اسے ذوالحجہ کا چاند طلوع ہونے کے بعد سے قربانی تک اپنے بال اور ناخن کاٹنے سے منع فرمایا گیا ہے، لیکن یہ حکم وجوبی نہیں، بلکہ استحبابی ہے، یعنی اس پر عمل کرنا بہتر ہے، لہذا اگر کسی نے بال یا ناخن کاٹ لیے، تو گنہگار نہیں۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ موئے زیرِ ناف و بغل اور ناخن، چالیس دن کے اندر کاٹنا ضروری ہیں، چالیس دن سے زائد بڑھانا مکروہ تحریمی، ناجائز و گناہ ہے، لہذا اگر کسی نے کئی دن سے ناخن یا موئے زیرِ ناف و بغل نہ کاٹے ہوں اور قربانی تک نہ کاٹنے سے چالیس دن سے زائد کا عرصہ ہو جائے گا، تو اب وہ اس مستحب پر عمل نہیں کر سکتا۔

قربانی کرنے والا اپنے ناخن اور بال نہ کاٹے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "من کان لہ ذبح یذبحہ فاذا اھل ھلال ذی الحجۃ، فلا یاخذن من شعرہ ولا من اظفارہ شیئاً حتی یضحی" ترجمہ: جس کے پاس قربانی کے لیے جانور ہو، جسے وہ قربان کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو جب ذوالحجہ کا چاند طلوع ہو جائے، وہ اپنے بالوں اور ناخنوں سے کچھ بھی نہ کاٹے، حتی کہ قربانی کر لے۔"(1)

یونہی جامع ترمذی میں ہے، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: "من رای ھلال ذی الحجۃ واراد ان یضحی، فلا یاخذن من شعرہ ولا من اظفارہ" ترجمہ: جو ذوالحجہ کا چاند دیکھے اور قربانی کا ارادہ رکھتا ہو، تو وہ اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے۔"(2)

مراۃ المناجیح میں ہے: "جو امیر وجوباً یا فقیر نفلاً قربانی کا ارادہ کرے، وہ بقر عید کا چاند

1...(صحیح مسلم، کتاب الاضاحی، باب نھی من دخل۔۔الخ، جلد2، صفحہ160، مطبوعہ کراچی)

2...(جامع ترمذی، ابواب الاضاحی، باب ترک اخذ الشعر لمن اراد ان یضحی، جلد1، صفحہ278، کراچی)

دیکھنے سے قربانی کرنے تک ناخن بال اور مردار کھال وغیرہ نہ کاٹے، نہ کٹوائے تاکہ حاجیوں سے قدرے مشابہت ہو جائے، کہ وہ لوگ احرام میں حجامت نہیں کرا سکتے اور تاکہ قربانی ہر بال، ناخن کا فدیہ بن جائے۔ یہ حکم استحبابی ہے، وجوبی نہیں، لہٰذا قربانی والے پر حجامت نہ کرانا بہتر ہے، لازم نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اچھوں سے مشابہت بھی اچھی ہے۔"[1]

فتاوی رضویہ میں ہے: "یہ حکم صرف استحبابی ہے، کرے تو بہتر ہے، نہ کرے تو مضائقہ نہیں، نہ اس کو حکم عدولی کہہ سکتے ہیں، نہ قربانی میں نقص آنے کی کوئی وجہ، بلکہ اگر کسی شخص نے ۳۱ (اکتیس) دن سے کسی عذر کے سبب خواہ بلا عذر ناخن نہ تراشے ہوں، نہ خط بنوایا ہو کہ چاند ذی الحجہ کا ہو گیا، تو وہ اگرچہ قربانی کا ارادہ رکھتا ہو، اس مستحب پر عمل نہیں کر سکتا، اب دسویں تک رکھے گا، تو ناخن و خط بنوائے ہوئے اکتالیسواں دن ہو جائے گا اور چالیس دن سے زیادہ نہ بنوانا گناہ ہے، فعل مستحب کے لئے گناہ نہیں کر سکتا۔"[2]

(2) جو شخص قربانی نہ کر سکے، اگر وہ بھی اس عشرہ مبارکہ (یعنی ذو الحج کے پہلے دس ایام) میں بال اور ناخن کاٹنے سے رُکا رہے، پھر بعد نمازِ عید حجامت وغیرہ کروالے، تو قربانی کا ثواب پائے گا۔

سنن ابو داؤد و نسائی میں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "امرت بیوم الاضحی عیداً، جعلہ اللہ عزوجل لھذہ الامۃ، فقال الرجل: ارایت ان لم اجد الّا منیحۃ انثی، افاضحی بھا؟ قال: لا، لکن تاخذ من شعرک وتقلم اظفارک وتقص شاربک وتحلق عانتک، فذلک تمام اضحیتک عند اللہ

1۔۔۔(مراۃ المناجیح، جلد2، صفحہ370، نعیمی کتب خانہ، گجرات)

2۔۔۔(فتاوی رضویہ، جلد20، صفحہ353، رضا فاؤنڈیشن، لاھور)

عزوجل "ترجمہ: مجھے یوم اضحیٰ کا حکم دیا گیا، اس دن کو اللہ عزوجل نے اس امت کے لیے عید بنایا۔ ایک شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگر میرے پاس منیحہ (یعنی ادھار لیے گئے جانور) کے سوا کوئی جانور نہ ہو، تو کیا اسی کی قربانی کر دوں؟ فرمایا: نہیں۔ ہاں! تم اپنے بال، ناخن اور مونچھیں تراشو اور موئے زیر ناف مونڈھ لو، اسی میں تمہاری قربانی اللہ عزوجل کے ہاں پوری ہو جائے گی۔"[1]

مراۃ المناجیح میں ہے: "جو قربانی نہ کر سکے، وہ بھی اس عشرہ میں حجامت نہ کرائے، بقر عید کے دن بعدِ نماز حجامت کرائے، تو ان شاء اللہ ثواب پائے گا، جیسا کہ بعض روایت میں ہے۔"[2]

صدر الشریعہ مولانا مفتی محمد امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ مذکورہ حدیثِ پاک ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "یعنی جس کو قربانی کی توفیق نہ ہو، اسے ان چیزوں کے کرنے سے قربانی کا ثواب حاصل ہو جائے گا"۔[3]

و اللہ اعلم عزوجل و رسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

28ذو القعدۃ الحرام1440ھ/01اگست2019ء

فتویٰ62:

مسجد قباء میں دو رکعت پڑھنے کا ثواب

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین اِس مسئلے کے بارے میں کہ کیا یہ بات

1...(سنن نسائی، کتاب الضحایا، باب من لم یجد الاضحیۃ، جلد2، صفحہ201، مطبوعہ لاھور)

2...(مراۃ المناجیح، جلد2، صفحہ370، نعیمی کتب خانہ، گجرات)

3...(بہار شریعت، حصہ15، صفحہ330، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

درست ہے کہ جو شخص مسجدِ قباء شریف میں دو رکعت نفل ادا کرے، اُسے عمرے کے برابر ثواب حاصل ہوتا ہے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

جی ہاں! جو شخص مسجد قباء شریف حاضر ہو اور دو رکعت نفل ادا کرے، تو اُسے ایک عمرہ کے برابر اَجر و ثواب حاصل ہونے کی بشارت ہے۔

چنانچہ امام ابو عبد اللہ محمد بن یزید قزوینی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ(سالِ وفات:273ھ/887ء) فرمانِ مصطفیٰ صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ روایت کرتے ہیں:"من تطهر في بيته ثم أتى مسجد قباء، فصلى فيه صلاة، كان له كأجر عمرة" ترجمہ: جس نے اپنے گھر سے اچھی طرح وضو کیا، پھر مسجد قباء آیا اور اُس میں نماز ادا کی، تو اُس کے لیے ایک عمرہ کے برابر ثواب ہے۔[1]

امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ(سالِ وفات:279ھ/892ء) حدیث روایت کرتے ہیں:"الصلاة في مسجد قباء كعمرة" ترجمہ: مسجدِ قباء میں نفل نماز کی ادائیگی کا ثواب ایک عمرہ کی مانند ہے۔[2]

خود نبی اکرم صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے عمل مبارک کے متعلق ابو حسین امام مسلم بن حجاج قشیری رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ(سالِ وفات:261ھ/875ء) نقل کرتے ہیں:"كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يأتي مسجد قباء راكبا وماشيا فيصلي فيه ركعتين" ترجمہ: نبی اکرم صَلَّی

1...(سنن ابن ماجۃ، باب ما جاء في الصلاۃ في مسجد قباء، جلد1، صفحہ453، مطبوعہ دار احیاء الکتب العربیۃ)

2...(جامع الترمذی، باب ما جاء في الصلاۃ في مسجد قباء، جلد1، صفحہ356، دار الغرب الاسلامی، بیروت)

اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ پیدل یا سوار ہو کر مسجدِ قباء تشریف لاتے اور وہاں آکر دو رکعت نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔[1]

اِس حدیث کی شرح میں علامہ علی قاری حنفی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ(سالِ وفات:1014ھ/1605ء)امام شرف الدین طیبی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ سے ایک نکتہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:"فیہ دلیل علی أن التقرب بالمساجد ومواضع الصلحاء مستحب"ترجمہ:اِس حدیث مبارک میں اِس بات پر دلیل موجود ہے کہ باہتمام مسجدوں اور خدا کے متقی وصالح لوگوں کے مقامات کی حاضری اور زیارت کے لیے جانا مستحب ہے۔[2]

نوٹ: دیگر بہت سی روایات میں نبی اکرم صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کا مسجدِ قباء جانا ہفتہ کے دن ثابت ہے، لیکن یاد رہے کہ عمرہ کے برابر اجر وثواب کا حصول صرف ہفتہ کے دِن حاضری کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ کسی بھی دن حاضری اور دو رکعت نفل کی ادائیگی سے ثواب کا حصول ہونے کی امید ہے، کیونکہ نبی اکرم صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے فرامین میں بغیر دِن کی قید کے ثواب کی نوید بیان کی گئی ہے، جیسا کہ اوپر فتویٰ میں بھی دو روایات نقل کی گئی ہیں، جن میں دِن کی قید کے بغیر ثواب کو بیان کیا گیا ہے۔اِسی بات کو "المسلك المتقسط" میں یوں لکھا گیا:"صح عنہ ان صلاۃ رکعتین فیہ کثوابِ عمرۃ ای سواء یکون یوم السبت او غیرہ لعمومہ"ترجمہ:نبی اکرم صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ سے بطریقِ صحیح یہ روایت ثابت ہے کہ مسجدِ قباء میں دو رکعتیں ادا کرنا ایک عمرہ کے ثواب کی مثل ہے، یعنی برابر ہے کہ مسجدِ قباء کی حاضری ہفتہ

1...(صحیح المسلم، باب فضل مسجد قباء، جلد2، صفحہ1016، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

2...(مرقاۃ المفاتیح، باب المساجد، جلد2، صفحہ373، مطبوعہ دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

کے دن ہو یا اِس کے علاوہ، کیونکہ روایت میں عموم ہے۔[1]

دوسری بات یہ کہ نبی کریم صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کا "ہفتہ" کے دن جانا صرف "ہفتہ" کے دن جانے کی افضلیت کو ظاہر کرنے کے لیے تھا، ثواب کو ہفتہ پر موقوف کرنے کے لیے نہ تھا، چنانچہ علامہ علی قاری حنفی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ(سالِ وفات:1014ھ/1605ء) لکھتے ہیں:"(یوم السبت) انما ھو بیان زمان الافضل لما روی اتیانه صلی اللہ علیه وسلم یوم الاثنین ایضاً وصبیحة عشر من رمضان و کان عمر رضی اللہ عنه یاتی قباء یوم الاثنین والخمیس" ترجمہ: ہفتہ کا دن تو صرف افضل وقت اور افضل دن بیان کرنے کے لیے تھا، کیونکہ خود نبی اکرم صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ سے ہی پیر اور رمضان کی دَسویں صبح مسجدِ قباء آنا مروی ہے، یونہی حضرت عمر فاروق رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہ ہر پیر اور جمعرات کو مسجد قباء آیا کرتے تھے۔[2]

واللہ اعلم عزوجل **ورسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

29ذو القعدۃ الحرام1443ھ/29جون2022ء

فتویٰ63:

عورت کا مسجد حرام میں نماز پڑھنا بہتر ہے یا رہائش گاہ میں؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ خواتین حج و عمرہ کے لیے جاتی ہیں، تو خواتین کا مکہ میں مسجد حرام میں نماز پڑھنا بہتر ہے یا ہوٹل میں بہتر ہے؟ نیز مسجد حرام کے قریب ہوٹل میں نماز پڑھنے سے ایک نیکی کا ایک لاکھ نیکیوں کے برابر

1...(المسلک المتقسط شرح المنسک المتوسط، صفحه734، مطبوعه المکتبة الامدادیه، مکة المکرمة)

2...(المسلک المتقسط شرح المنسک المتوسط، صفحه733، مطبوعه المکتبة الامدادیه، مکة المکرمة)

ثواب ملے گا یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

عورت کا ہوٹل یا جہاں رہائش ہو، وہاں نماز پڑھنا، مسجد حرام میں نماز پڑھنے سے افضل ہے ، کیونکہ نبی پاک صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے اپنے مبارک زمانے میں بھی عورتوں کے گھر میں نماز پڑھنے کو مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل قرار دیا تھا۔ اور عام طور پر زائرین کے لیے ہوٹل حدودِ حرم میں واقع ہوتے ہیں اور ایک نیکی پر ایک لاکھ نیکیوں کا ثواب اور ایک گناہ پر ایک لاکھ گناہوں کا وبال مسجد حرام کے ساتھ خاص نہیں ، بلکہ حدودِ حرم میں جہاں بھی نیکی یا گناہ کیا جائے گا ، تو اس کا ثواب اور وبال ایک لاکھ کے برابر ہی ہو گا ، جیسا کہ خود نبی کریم صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے شہر مکہ کے ماہِ رمضان کو اس کے علاوہ ماہِ رمضان کے ایک لاکھ مہینوں کے برابر اجر و ثواب والا قرار دیا۔ نیز جب آپ صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے حدیبیہ کے مقام پر قیام کیا، تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسّلام حِل میں (حدودِ حرم سے باہر) تھے ، لیکن (نماز کی ادائیگی کے لیے) آپ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا مصلی حدودِ حرم میں تھا۔

یونہی حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہ حدودِ حرم سے باہر قیام پذیر تھے ، لیکن نماز کے لیے مصلی حرم کی حدود میں بچھاتے تھے ، جب حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہ سے ایسا کرنے کی وجہ پوچھی گئی ، تو فرمایا: (ایسا اس لیے کرتا ہوں) کیونکہ حدودِ حرم میں عمل کرنا افضل ہے اور یہاں خطا کرنے کا وبال بھی زیادہ ہے۔

ان کے علاوہ دیگر احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک نیکی پر ایک لاکھ نیکیوں کا

ثواب اور ایک گناہ پر ایک لاکھ گناہوں کا وبال مسجد حرام کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ پورے حرم کا یہی حکم ہے، لہذا عورت یا مرد کا حدودِ حرم میں واقع ہوٹل پر نماز پڑھنے کا اجر و ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہو گا۔

گھر میں نماز پڑھنے کے افضل ہونے کے متعلق سننِ ابی داؤد میں ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: "بیوتھن خیر لھن" ترجمہ: عورتوں کے لیے ان کے گھر بہتر ہیں۔[1]

اس حدیث کے تحت علامہ علی قاری حنفی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ لکھتے ہیں: " (بیوتھن) ای عبادتھن فیھا (خیر لھن)۔۔۔من الصلاۃ فی المسجد "ترجمہ: عورتوں کے لیے ان کے گھروں میں عبادت کرنا، ان کے لیے مسجد میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔[2]

یونہی مفتی محمد احمد یار خان نعیمی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ لکھتے ہیں: "یعنی اس زمانہ میں بھی عورتوں کے لیے گھر میں ہی نماز افضل قرار دی گئی۔"[3]

مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ام حمید رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْھَا سے مروی ہے: " قالت: قلت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یمنعنا ازواجنا ان نصلی معک و نحب الصلاۃ معک فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلاتکن فی بیوتکن افضل من صلاتکن فی حجرکن صلاتکن فی حجرکن افضل من صلاتکن فی الجماعۃ" ترجمہ: حضرت ام حمید رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْھَا کہتی ہیں کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ! ہمارے شوہر ہمیں آپ کے ساتھ نماز پڑھنے سے منع کرتے ہیں، حالانکہ ہم آپ کے ساتھ نماز پڑھنا پسند کرتی ہیں،

1...(ابوداؤد، کتاب الصلاۃ، جلد1، صفحہ155، مطبوعہ دار الرسالۃ العالمیہ)

2...(مرقاۃ المفاتیح، کتاب الصلاۃ، باب الجماعۃ وفضلھا، ج3، ص837، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، لبنان)

3...(مرأۃ المناجیح، ج2، ص155، مطبوعہ نعیمی کتب خانہ، گجرات)

تو رسول اللہ صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے فرمایا: تم عورتوں کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا، صحن میں نماز پڑھنے سے افضل ہے اور تمہارا اپنے صحن میں نماز پڑھنا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے سے افضل ہے۔[1]

ملک العلماء علامہ کاسانی حنفی رحمہ اللہ تعالی لکھتے ہیں: ”لا خلاف في أن الأفضل أن لا يخرجن في صلاة لما روي عن النبي صلى اللہ عليه وسلم أنه قال: صلاة المرأة في دارها أفضل من صلاتها في مسجدها“ ترجمہ: اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ افضل یہی ہے کہ عورتیں کسی نماز میں (گھر سے) نہ نکلیں، کیونکہ نبی کریم صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ سے مروی ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسَّلام نے فرمایا: عورت کا اس کے گھر میں نماز پڑھنا، اس کے مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے۔[2]

شہر مکہ میں ایک رمضان کا ثواب لاکھ رمضان کے مہینوں کے برابر ہونے کے متعلق

سنن ابن ماجہ میں ہے: ”عن ابن عباس، قال: قال رسول اللہ صلى اللہ عليه وسلم: من أدرك رمضان بمكة فصامه وقام منه ما تيسر له، كتب اللہ له مائة ألف شهر رمضان فيما سواها“ ترجمہ: حضرت ابنِ عباس رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُمَا بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: جس نے مکہ مکرمہ میں ماہِ رمضان پایا اور اُس کے روزے رکھے اور جتنا میسر آیا، قیام کیا، تو اللہ تعالیٰ اُس کے لیے مکہ کے علاوہ کسی اور مقام پر ایک لاکھ رمضان کے مہینوں کے برابر ثواب عطا فرمائے گا۔[3]

1...(مصنف ابن ابی شیبہ، ج 2، ص 157، مطبوعہ مکتبۃ الرشد، الریاض)

2...(بدائع الصنائع، ج 1، کتاب الصلاۃ، ص 275، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

3...(سنن ابن ماجہ، ج 4، باب صوم شھر رمضان بمکۃ، ص 296، مطبوعہ دار الرسالۃ العالمیہ)

مذکورہ حدیث مبارک کے تحت علامہ علی قاری حنفی رحمہ اللہ تعالی لکھتے ہیں: "ثم المضاعفة لا تختص بالصلاة بل تعم سائر الطاعات، وبه صرح الحسن البصري فقال: صوم يوم بمكة بمائة ألف، وصدقة درهم بمائة ألف، وكل حسنة بمائة ألف۔۔۔ وذهب جماعة من العلماء إلى أن السيئات تضاعف بمكة كالحسنات" ترجمہ: پھر یہ ثواب کا زیادہ ہونا، صرف نماز کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ (شہرِ مکہ میں کی جانے والی) ساری نیکیوں اور عبادتوں کو شامل ہے، اِسی چیز کی صراحت حضرت امام حسن بصری رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ نے کی ہے، چنانچہ فرمایا: مکہ میں ایک دن کا روزہ ایک لاکھ روزوں کے برابر ہے۔ ایک درہم کا صدقہ ایک لاکھ درہم کے مساوی ہے اور ہر نیکی ایک لاکھ کے برابر ہے۔ علمائے دین کی ایک جماعت نے یہ مؤقف بھی اختیار کیا کہ مکہ مکرمہ میں نیکیوں میں اضافہ ہونے کی طرح گناہوں کے وبال میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔[1]

نبی کریم صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے حدودِ حرم سے باہر ہوتے ہوئے بھی نماز حدودِ حرم میں پڑھنے کے متعلق مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے: "ان رسول اللہ صلى الله عليه وسلم خرج عام صدوه، فلما انتهى إلى الحديبية اضطرب في الحل، وكان مصلاه في الحرم" ترجمہ: رسول اللہ صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ (جب) اُس سال نکلے جس سال لوگوں نے آپ علیہ الصلوۃ والسَّلام کو روک دیا، تو جب آپ علیہ الصلوۃ والسَّلام مقامِ حدیبیہ پر پہنچے، تو حِل (حدودِ حرم سے باہر) میں پریشانی میں ٹھہرے، درحال کہ آپ علیہ الصلوۃ والسَّلام کا مصلی حرم میں تھا۔[2]

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہ کے حدودِ حرم میں نماز پڑھنے کے

1...(مرقاۃ المفاتیح، ج2، کتاب الصلوۃ، ص369، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان)

2...(مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب المغازی، باب غزوۃ الحدیبیۃ، جلد 7، صفحہ383، مطبوعہ مکتبۃ الرشد، الریاض)

متعلق مصنف عبد الرزاق میں ہے: "اخبرني عبدالكريم الجزري انه سمع مجاهدا يقول رأيت عبد الله بن عمرو بن العاص بعرفة ومنزله في الحل ومصلاه في الحرم فقيل له لم تفعل هذا فقال لأن العمل فيه أفضل والخطيئة أعظم فيه" ترجمہ: عبد الکریم جزری رَحْمَةُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ نے خبر دی کہ انہوں نے حضرت مجاہد کو کہتے ہوئے سنا کہ میں نے عبد اللہ بن عمرو بن العاص رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہ کو عرفہ میں دیکھا، ان کا قیام حِل میں ہوتا اور ان کا مصلی حرم میں ہوتا، تو ان سے پوچھا گیا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ تو آپ رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہ نے فرمایا: اس لیے کہ حرم میں عمل کرنا افضل ہے اور حرم میں خطا بھی بڑی ہے۔[1]

علامہ ابنِ عابدین شامی دِمشقی رَحْمَةُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (سالِ وفات: 1252ھ/1836ء) نقل کرتے ہیں: "قال الشيخ ولي الدين العراقي: ولا يختص التضعيف بالمسجد الذي كان في زمنه صلى الله عليه وسلم، بل يشمل جميع ما زيد فيه، **بل المشهور عند أصحابنا أنه يعم جميع مكة بل جميع حرمها الذي يحرم صيده** كما صححه النووي انتهى ما أفاده شيخ مشائخنا محمد بن ظهيرة القرشي الحنفي المكي" ترجمہ: شیخ ولی الدین عراقی نے فرمایا کہ یہ ثواب کا زیادہ ہونا اس مسجد کے ساتھ خاص نہیں، جو نبی کریم صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے زمانے میں تھی، بلکہ یہ اس تمام کو بھی شامل ہے، جس کا بعد میں بھی اضافہ کیا گیا، بلکہ ہمارے اصحاب کے نزدیک مشہور یہی ہے کہ یہ (فضیلت) جمیع مکہ مکرمہ، بلکہ جمیع حرم کہ جس میں شکار حرام ہے، اس کو عام ہے، جیسا کہ امام نووی نے اس کی تصحیح کی، وہ کلام مکمل ہوا، جس کا فائدہ ہمارے مشائخ کے شیخ محمد بن ظہیرہ قرشی حنفی مکی نے دیا۔[2]

1...(مصنف عبد الرزاق، کتاب المناسک، جلد5، صفحہ27، مطبوعہ المکتب الإسلامي، بیروت)

2...(ردالمحتار، جلد1، صفحہ659، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

مفتی محمد وقار الدین رضوی رَحۡمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیۡہِ لکھتے ہیں: ''مسجد حرام وہ عمارت ہے، جو کعبہ کے ارد گرد بنی ہوئی ہے۔ اس کی حدود اس کی مکانیت تک محدود ہیں، جبکہ حدودِ حرم کی وسعت اس کے علاوہ بھی ہے۔ مسجد حرام میں ایک نماز کا ثواب، دوسری مسجدوں میں جو ثواب ملتا ہے اس سے ایک لاکھ گنا زیادہ ہے۔ حدیث مبارک میں ہے: ''ان حسنات الحرم کل حسنۃ بمائۃ الف حسنۃ'' یعنی حرم میں کی گئی ہر ایک نیکی، ایک لاکھ نیکیوں کے برابر ہے۔ اسی طرح باجماعت نماز ادا کرنے کا ثواب، جبکہ جماعتِ صحیح میسر ہو، تو ایک رکعت پر ستائیس لاکھ رکعات کا ثواب ملے گا۔ نوٹ: **یہ فضیلت پورے حرم اور ہر نیکی کے لیے ہے۔**''[1]

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

ایک روایت میں رسول اللہ صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے خاص مسجد حرام میں نماز کو اس کے علاوہ کسی مسجد میں ایک لاکھ نمازوں سے افضل قرار دیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نیکی کا اجر و ثواب ایک لاکھ نیکیوں کے برابر فقط مسجد حرام کے ساتھ خاص ہے، مکمل حدودِ حرم مراد نہیں، جیسا کہ سننِ ابن ماجہ میں ہے: ''صلاۃ فی المسجد الحرام افضل من مائۃ الف صلاۃ فیما سواہ'' ترجمہ: مسجد حرام میں نماز پڑھنا اس کے علاوہ کسی مسجد میں ایک لاکھ نمازوں سے افضل ہے۔[2]

اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں مسجد حرام سے مراد مکمل حرمِ مکہ ہے، جیسا کہ قرآن و سنت میں کئی مقامات پر مسجد حرام سے مراد مکمل حدودِ حرم لی گئی ہے، جس کی چند امثلہ پیش

1...(وقار الفتاوی، جلد2، صفحہ264، بزم وقار الدین، مطبوعہ کراچی)

2...(سنن ابن ماجہ، جلد1، صفحہ451، مطبوعہ دار احیاء الکتب العربیہ)

ہیں۔

(1) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا﴾ ترجمہ کنزالعرفان: ”اے ایمان والو! مشرک بالکل ناپاک ہیں، تو اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب نہ آنے پائیں۔“[(1)]

مذکورہ آیت میں ”مسجد حرام“ سے پورا حرم مراد لیا گیا، یعنی مشرکین کا داخلہ صرف مسجد حرام میں منع نہیں، بلکہ حدودِ حرم میں داخل ہونا، ممنوع ہے، جیسا کہ ابو محمد علی بن احمد بن سعید اندلسی قرطبی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ لکھتے ہیں: ”فإن اللہ تعالی یقول: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا﴾ فلم یختلفوا فی أنه تعالی أراد الحرم کله“ ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بے شک مشرکین ناپاک ہیں، تو وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے قریب نہ آئیں۔ اس بات میں اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے (مسجد حرام سے) پورا حرم مراد لیا ہے۔[(2)]

(2) یونہی اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌؕ وَ مَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْیًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ﴾ ترجمہ کنزالعرفان: ”اے ایمان والو! حالتِ احرام میں شکار کو قتل نہ کرو اور تم میں جو اسے قصداً قتل کرے، تو اس کا بدلہ یہ ہے کہ مویشیوں میں سے اسی طرح کا وہ جانور دیدے، جس کے شکار کی مثل ہونے کا تم میں سے دو معتبر آدمی فیصلہ کریں، یہ کعبہ کو پہنچتی ہوئی قربانی ہو۔[(3)]

1...(پارہ 10، سورۃ التوبۃ، آیت 28)

2...(المحلی بالآثار، ج 5، ص 149، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

3...(پارہ 07، سورۃ المائدۃ، آیت 95)

اس آیت میں بھی کعبہ سے مراد عین کعبہ نہیں، بلکہ پورا حرم مراد ہے، جیسا کہ علامہ بدرالدین عینی رَحۡمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیۡہِ لکھتے ہیں: ﴿هَدۡيًۢا بٰلِغَ الۡكَعۡبَةِ﴾ وصفه بكونه بالغ الكعبة، والمراد من الكعبة الحرم لان عين الكعبة غير مراد بالاجماع لانها تصان عن اراقة الدماء، فاريد بها ما حولها، وهو الحرم "ترجمہ: "ایسی قربانی ہو جو کعبہ کو پہنچتی ہو" (اس آیت میں) قربانی کو کعبہ تک پہنچنے والے وصف کے ساتھ موصوف کیا اور کعبہ سے مراد حرم ہے، کیونکہ (یہاں) عینِ کعبہ تو بالاجماع مراد نہیں ہے، کیونکہ اسے (کعبہ کو) خون بہانے سے محفوظ رکھا گیا ہے، لہٰذا یہاں کعبہ سے اس کے ارد گرد کا (علاقہ) مراد ہے اور وہ حرم ہے۔[1]

نیز مسجد حرام سے حدودِ حرم مراد ہونے پر نبی پاک صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کا یہ فرمان: "من أدرك رمضان بمكة" بھی شاہد ہے کہ آپ صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے شہر مکہ یعنی حدودِ حرم میں ایک نیکی کا اجر و ثواب ایک لاکھ نیکیوں کے برابر قرار دیا (مکمل حدیث اوپر فتوے میں مذکور ہے)، یونہی آپ صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اور صحابہ کرام عَلَیۡہِمُ الرِّضۡوَان کا حِل (حدودِ حرم سے باہر) میں قیام کے باوجود نماز حدودِ حرم میں پڑھنا بھی (جیسا کہ اوپر فتوے میں گزرا) اس بات پر دلیل ہے کہ ثواب کا مدار حدودِ حرم مکمل ہے، مسجد حرام خاص نہیں، لہٰذا جس حدیث میں مسجد حرام کا ذکر ہے، وہاں مسجد حرام سے مراد مکمل حرم ہے۔

واللہ اعلم عزوجل **و رسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبــــــــــــــــــــہ	**الجواب صحیح**
المتخصص فی الفقہ الاسلامی	**مفتی محمد قاسم عطاری**
عبدالرب شاکر عطاری قادری	
05 محرم الحرام 1445ھ / 24 جولائی 2023	

1 ...(البنایۃ شرح ھدایۃ، کتاب الحج، فصل صید البرالخ، ج 4، ص 386، بیروت، لبنان)

فتوی 64:

ایام تشریق کی راتیں منیٰ میں گزارنا حاجی کے لیے واجب ہے؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ کیا حاجی کے لیے ایامِ تشریق کی راتیں منیٰ میں گزارنا واجب ہے؟ اگر کوئی منیٰ میں راتیں نہ گزارے، تو کیا حکم ہے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

نو ذوالحجہ کی طلوعِ فجر سے تیرہ ذوالحجہ کی غروب آفتاب تک ایامِ تشریق کہلاتے ہیں، ان میں جو بھی راتیں آئیں، ان میں سے کوئی بھی رات منیٰ میں گزارنا واجب نہیں، البتہ دسویں، گیارہویں کی راتیں یعنی ان کا اکثر حصہ منیٰ میں گزارنا اور اگر تیرھویں دن بھی منیٰ میں رہنا ہے، تو اب بارھویں کی رات بھی منیٰ میں گزارنا سنتِ مؤکدہ ہے، بلا عذرِ شرعی اس کو ترک کرنا بُرا ہے، البتہ ترک کرنے کی وجہ سے اس پر کوئی کفارہ لازم نہیں ہو گا۔

واضح رہے کہ حج کے معاملہ میں راتیں گزشتہ دن کے تابع ہوتی ہیں، لہٰذا مذکورہ مسئلہ میں دسویں رات سے مراد وہ رات ہے، جو دس تاریخ کے دن کے بعد آئے، اسی طرح گیارھویں اور بارھویں کی راتوں سے مراد وہ راتیں ہیں، جو گیارہ تاریخ اور بارہ تاریخ کے دن کے بعد آئیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ حج پر جانے سے پہلے بھی آٹھ ذوالحجہ کا دن اور اس کے بعد کی رات منیٰ میں گزارنا سنتِ مؤکدہ ہے۔

البحر الرائق میں ہے: ”أنها ليست بواجبة؛ لأن المقصود الرمي لكن هي سنة“

یعنی ایامِ رمی کے دوران منیٰ میں رات گزارنا واجب نہیں، کیونکہ مقصود رمی ہے، لیکن رات گزارنا سنت ہے۔[1]

رسائل الارکان میں ہے:"التبییت بمنی تلک الایام لیس واجبا حتی یجب الجابر بترکہ"یعنی منیٰ میں ان ایام کی راتیں گزارنا واجب نہیں کہ اس کے ترک کی وجہ سے کوئی کفارہ واجب ہو۔[2]

طوافِ زیارت کرنے کے بعد رمی کے لیے منیٰ آنے کے متعلق در مختار میں ہے:"(ثم اتی منی) فیبیت بھا للرمی"یعنی پھر وہ منی آئے، پس منیٰ میں رمی کرنے کے لیے رات گزارے۔

اس کے تحت رد المحتار میں ہے:"ای لیالی ایام الرمی ھو السنة فلو بات بغیرھا کرہ ولا یلزمہ شیئ"یعنی (منیٰ میں) ایامِ رمی کی راتیں گزارے، یہ سنت ہے، لہٰذا اگر منیٰ کے علاوہ کہیں اور رات گزارتا ہے، تو مکروہ ہے اور اس پر کوئی چیز لازم نہیں ہو گی۔[3]

مناسک ملا علی قاری میں ہے:"(والبیتوتة بمنی لیالی ایامہ) ای لمن اختار التاخر الی یوم الرابع ولا ففی لیلتین۔۔۔(وھذہ) ای ھذہ المذکورات (ھی المؤکدة) ای السنن المؤکدة۔۔۔(وحکم السنن) ای المؤکدة (الاساءة بترکھا) ای لو ترکھا عمدا"یعنی ایامِ رمی کی راتیں منیٰ میں گزارنا سنت ہے، اس شخص کے لیے جس نے چوتھے دن تک رکنا اختیار کیا، ورنہ دو راتیں ہیں۔۔۔اور جو ذکر کی گئیں یہ مؤکدہ سنتیں ہیں اور سنن مؤکدہ کا حکم یہ ہے کہ اس کو

1...(البحر الرائق، جلد2، صفحہ374، مطبوعہ بیروت)

2...(رسائل الارکان، صفحہ728، بیروت)

3...(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد3، صفحہ617، مطبوعہ بیروت)

ترک کرنا برا ہے جبکہ جان بوجھ کر ترک کیا ہو۔[1]

مبسوط سرخسی میں ہے:"(إن كان أقام أيام منى بمكة غير أنه يأتي منى في كل يوم فيرمي الجمار فقد أساء، ولا شيء عليه) لأنه ما ترك إلا السنة، وهي البيتوتة بمنى في ليالي الرمي "یعنی اگر کسی نے ایامِ منیٰ کے دوران مکہ میں قیام کیا، لیکن ہر دن منیٰ آکر رمیِ جمار کرتا رہا، تو اس نے بُرا کیا اور اس پر کوئی چیز لازم نہ ہو گی، کیونکہ اس نے سنت ترک کی اور وہ سنت رمی کی راتیں منیٰ میں گزارنا ہے۔[2]

علامہ ابنِ عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:"ان اللیالی فی الحج فی حکم الایام الماضیۃ لا المستقبلۃ "یعنی حج میں راتیں گزشتہ ایام کے حکم میں ہیں، نہ کے آنے والے ایام کے حکم میں۔[3]

آٹھ ذوالحجہ کا دن اور اس کے بعد آنے والی رات منیٰ میں گزارنا سنت ہے۔اس کے متعلق لباب المناسک، حج کی سنتوں کے بیان میں ہے:"(والخروج من مکۃ الی منی یوم الترویۃ)ای بعد فجرہ حتی یصلی خمس صلوات فی منی (والبیتوتۃ)ای کون اکثر اللیل (بمنی لیلۃ عرفۃ)ای لا بمکۃ ولا بعرفات الا لحادث من الضرورات۔۔۔(وھذہ)ای ھذہ المذکورات (ھی المؤکدۃ) ای السنن المؤکدۃ"یعنی یومِ ترویہ (آٹھ ذوالحجہ) منیٰ کی طرف نکلنا سنت ہے یعنی یومِ ترویہ کی فجر کے بعد یہاں تک کہ منیٰ میں پانچ نمازیں پڑھے اور عرفہ کی رات کا اکثر حصہ منیٰ میں گزارنا، نہ کہ مکہ اور عرفات میں مگر یہ کہ کوئی شرعی ضرورت درپیش

1...۔(مناسک ملا علی قاری، صفحہ 104۔105، مطبوعہ مکۃ المکرمہ)

2...۔(المبسوط، جلد4، صفحہ 67، بیروت)

3...۔(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد3، صفحہ 619، مطبوعہ کوئٹہ)

ہو۔۔۔اور جو ذکر کی گئیں یہ مؤکدہ سنتیں ہیں۔[1]

اسی میں ایک اور مقام پر ہے:”(ان بات بمکۃ)وکذا بعرفۃ وغیرھما فالاولیٰ ان یقول:بغیر منی (تلک اللیلۃ جاز واساء)ای لترک السنۃ“یعنی اگر مکہ میں رات گزاری اور اسی طرح عرفہ وغیرہ میں رات گزاری ،پس بہتر یہ تھا کہ مصنف یوں کہتے: منیٰ کے علاوہ یہ رات گزاری تو جائز ہے اور ترکِ سنت کی وجہ سے اس نے برا کیا۔[2]

صدر الشریعہ مفتی امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ حج کی سنتیں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:”دس اور گیارہ کے بعد جو دونوں راتیں ہیں، ان کو منیٰ میں گزارنا اور اگر تیرھویں کو بھی منیٰ میں رہا تو بارھویں کے بعد کی رات کو بھی منیٰ میں رہے۔“[3]

رفیق الحرمین میں ہے:”(7)دسویں، گیارہویں اور بارھویں کی راتیں (اکثر یعنی ہر رات کا آدھے سے زیادہ حصہ) منیٰ شریف میں گزارنا سنت ہے۔(8)بارھویں کی رمی کر کے غروبِ آفتاب سے پہلے پہلے اختیار ہے کہ مکہ معظمہ زادھا اللہ شرفاً و تعظیما کو روانہ ہو جائیں، مگر بعدِ غروب چلا جانا معیوب ہے۔ اب ایک دن اور ٹھہرنا اور تیرھویں کو بدستور دوپہر ڈھلے (یعنی ابتدائے وقتِ ظہر)رمی کر کے مکہ شریف جانا ہو گا اور یہی افضل ہے۔“[4]

واللہ اعلم عزوجل و رسولہ اعلم صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم

کتبــــــــــــــــــــــــہ

مفتی ابو محمد علی اصغر عطاری مدنی

05شعبان المعظم1445ھ/16فروری2024ء

1...(مناسک ملا علی قاری، صفحہ104۔105،مطبوعہ مکۃ المکرمہ)

2...(مناسک ملا علی قاری، صفحہ267،مطبوعہ المکۃ المکرمہ)

3...(بہارِ شریعت، جلد1،صفحہ1051،مکتبۃ المدینہ، کراچی)

4...(رفیق الحرمین، صفحہ203،مکتبۃ المدینہ، کراچی)

فتوی 65:

کیامسجد حرام کے علاوہ حدود حرم میں بھی نیکی و گناہ ایک لاکھ کے برابر ہے؟

کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اِس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کوئی مسجد حرام کے علاوہ حدودِ حرم میں نیکی یا گناہ کرتا ہے، تو کیاوہ بھی لاکھ کے برابر ہے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

ایک نیکی پر لاکھ نیکیوں کے برابر ثواب یا ایک گناہ کا لاکھ گناہوں کے برابر وبال صرف مسجد الحرام سے خاص نہیں، بلکہ مکمل شہرِ مکہ کا یہی حکم ہے۔ خود نبی اکرم صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے بصراحت شہرِ مکہ میں ایک رمضان اور اُس کے روزوں کو ایک لاکھ رمضان کے مہینوں کے برابر قرار دیا۔ اِسی طرح جلیل القدر تابعی حضرت ابو سعید امام حسن بصری رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ نے مکہ مکرمہ میں ایک روزے کو ایک لاکھ روزوں اور ایک درہم صدقہ کرنے کو ایک لاکھ درہم صدقہ کرنے کے مساوی فرمایا۔ حضرتِ ابنِ عباس رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْھُمَا سے مکہ مکرمہ سے ہٹ کر طائف کو قیام گاہ بنانے کے متعلق سوال ہوا، تو آپ نے خوفِ خدا اور بربنائے تقویٰ ارشاد فرمایا: میں اُس شہر میں کیسے مستقل قیام رکھوں کہ جہاں نیکیوں کی طرح گناہوں کا وبال بھی بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ نیکی یا گناہ کی لاکھ سے برابری مسجد الحرام ہی نہیں، بلکہ پورے شہرِ مکہ کو محیط ہے۔

ابو عبد اللہ امام محمد بن ماجہ قُزوینی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ [وِصال 273ھ / 887ء] روایت نقل کرتے ہیں: ”عن ابن عباس، قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من أدرك رمضان بمكة

فصامه وقام منه ما تيسر له، کتب اللہ له مائة ألف شهر رمضان فيما سواها" ترجمہ: حضرت ابنِ عباس رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْھُمَا سے مروی ہے، آپ بتاتے ہیں کہ نبی اکرم صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: جس نے مکہ مکرمہ میں ماہِ رمضان پایا اور اُس کے روزے رکھے اور جتنا میسر آیا، قیام کیا، تو اللہ تعالیٰ اُس کے لیے مکہ کے علاوہ کسی اور مقام پر ایک لاکھ رمضان کے مہینوں کے برابر ثواب عطا فرمائے گا۔[1]

اِس حدیث کی شرح کرتے ہوئے نور الدین علامہ علی قاری حنفی [وِصال: 1014ھ/ 1605ء] لکھتے ہیں: "ثم المضاعفة لا تختص بالصلاة بل تعم سائر الطاعات، وبه صرح الحسن البصري فقال: صوم يوم بمكة بمائة ألف، وصدقة درهم بمائة ألف، وكل حسنة بمائة ألف۔۔۔ وذهب جماعة من العلماء إلى أن السيئات تضاعف بمكة كالحسنات" ترجمہ: پھر یہ اضافہ صرف نماز کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ (شہر مکہ میں کی جانے والی) ساری نیکیوں اور عبادتوں کو شامل ہے۔ اِسی چیز کی صراحت حضرت امام حسن بصری رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ نے کی ہے، چنانچہ فرمایا: مکہ میں ایک دن کا روزہ ایک لاکھ روزوں کے برابر ہے۔ ایک درہم کا صدقہ ایک لاکھ درہم کے مساوی ہے اور ہر نیکی ایک لاکھ کے برابر ہے۔ علمائے دین کی ایک جماعت نے یہ مؤقف بھی اختیار کیا کہ مکہ مکرمہ میں نیکیوں میں اضافہ ہونے کی طرح گناہوں کے وبال میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔[2]

اوپر والی سنن ابنِ ماجہ اور دیگر چند روایات نقل کرنے کے بعد ابو البقاء علامہ احمد مکی حنفی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ [وِصال: 854ھ/ 1450ء] نے لکھا: "قال محب الدين الطبري: وفي أحاديث

1...(سنن ابن ماجة، جلد 04، باب صوم شهر رمضان بمکہ، صفحہ 296، مطبوعہ دار الرسالۃ العالمیہ)

2...(مرقاۃ المفاتیح، جلد 02، کتاب الصلوٰۃ، صفحہ 369، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان)

مضاعفة الصلاۃ أو الصوم، دلیل علی اطراد التضعیف في جمیع الحسنات إلحاقاً بھما۔۔۔قال وھذا الحدیث یدل علی أن المراد بالمسجد الحرام في فضل تضعیف الصلاۃ بالحرم جمیعه؛ لأنه عمم التضعیف فی جمیع الحرم و کذلک حدیث تضعیف الصوم عممه فی جمیع مکة وحکم الحرم ومکة فی ذلک سواء باتفاق" ترجمہ: امام محب الدین طبری رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ نے فرمایا: نماز و روزے کے ثواب میں اضافے والی احادیث ، تمام نیکیوں کے ثواب میں اضافہ ہو جانے پر دلیل ہیں۔(اِس کے بعد امام حسن بصری رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ کا اثر نقل کیا)اور فرمایا: حرم میں نماز کے زیادہ ثواب میں وارِد حدیث میں "مسجدِ حرام" سے مراد سارا حرم ہی ہے اور یونہی روزے کے ثواب میں اضافے کو بیان کرتے ہوئے آپ صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے سارے مکہ کو عام رکھا اور بالاتفاق "مضاعفتِ ثواب" کی بشارت میں حرم اور مکہ کا حکم برابر ہے۔(یعنی جس طرح زیادہ ثواب حرم میں حاصل ہو گا، یونہی مکمل مکہ میں بھی حاصل ہو گا۔[1]

اِسی کتاب میں ہے:"قد سئل عن مقامه بغیر مکة فقال ما لی ولبلد تضاعف فیھا السیئات کما تضاعف الحسنات" ترجمہ: حضرتِ ابنِ عباس رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْھُمَا سے مکہ مکرمہ سے ہٹ کر دوسری جگہ قیام کرنے کے متعلق پوچھا گیا، تو آپ نے فرمایا: مجھے کیا ہے کہ میں اُس شہر میں مستقل قیام رکھوں، جہاں نیکیوں کی طرح گناہوں کا وبال بھی بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔[2]

امامِ اہلِ سنَّت ، امام احمد رضا خان رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ [وِصال:1340ھ/1921ء] فرماتے ہیں:"اور تَفَاوُتِ ثَوَاب (یعنی ثواب میں فرق) کا جواب باصواب (یعنی درست جواب) شیخ محقق (شاہ)عبد الحق (محدث) دہلوی رَحْمَۃُاللہِ تَعَالٰی عَلَیْہ نے کیا خوب دیا کہ:"مکہ میں کمیت زیادہ ہے

1...(البحر العمیق، جلد03، الباب العاشر فی دخول مکة، صفحہ 1321، مطبوعہ مؤسسة الریّان، بیروت)

2...(البحر العمیق، جلد03، الباب العاشر فی دخول مکة، صفحہ 1322، مطبوعہ مؤسسة الریّان، بیروت)

اور مدینہ میں کیفیت، یعنی وہاں ''مقدار'' زیادہ ہے اور یہاں ''قدر'' اَفزوں (زیادہ)۔ جسے یوں سمجھیں کہ لاکھ روپیہ زیادہ کہ پچاس ہزار اشرفیاں؟ گنتی میں وہ (یعنی لاکھ روپے) دُونے ہیں اور مالیت میں یہ (یعنی پچاس ہزار اشرفیاں) دس گُنی۔ مکہ معظمہ میں جس طرح ایک نیکی لاکھ نیکیاں ہیں، یوں ہی ایک گناہ لاکھ گناہ ہیں اور وہاں گناہ کے اِرادے پر بھی گرفت ہے، جس طرح نیکی کے اِرادے پر ثواب۔ مدینہ طیبہ میں نیکی کے اِرادے پر ثواب اور گناہ کے اِرادے پر کچھ نہیں اور گناہ کرے تو ایک ہی گناہ اور نیکی کرے تو پچاس ہزار نیکیاں۔ عجب نہیں کہ حدیث میں ''خَیْرٌ لَّھُمْ''کا اِشارہ اِسی طرف ہو کہ ان کے حق میں مدینہ ہی بہتر ہے۔''[1]

صدرالشریعہ مفتی محمد امجد علی اعظمی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ[وِصال:1367ھ/1947ء] لکھتے ہیں:'' مکہ معظمہ میں معصیت کرنا نہایت سخت بات ہے کہ یہاں جس طرح ایک نیکی لاکھ کے برابر ہے۔ یوہیں ایک گناہ لاکھ گناہ کے برابر۔[2]

مفتی شریف الحق امجدی رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ[وِصال:1421ھ/2000ء] ایک روایت کی شرح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:''حضرت حسن بصری رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ نے فرمایا کہ یہ زیادتی صرف نماز کے ساتھ خاص نہیں۔ ہر طاعت پر یہ زیادتی ہے اور فرمایا کہ مکہ معظمہ میں ایک روزہ لاکھ روزہ کے برابر ہے اور ایک درہم کا صدقہ لاکھ کے برابر بلکہ ہر نیکی لاکھ کے برابر ہے۔ اس بارے میں ایک حدیث حسن بھی مروی ہے کہ ارشاد فرمایا کہ حرم کی ایک نیکی لاکھ کے برابر ہے۔ علاوہ ازیں ابنِ ماجہ نے حضرت ابن عباس رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُمَا سے یہ حدیث روایت کی ہے

1...(ملفوظاتِ اعلیٰ حضرت، صفحہ237، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ، کراچی)

2...(بہارِ شریعت، جلد1، صفحہ1110، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

Go To Index

کہ فرمایا جس نے مکے میں رمضان پایا اور روزہ رکھا اور جتنا میسر آیا قیام کیا، تو اس کے لیے دوسری جگہوں کے رمضان کی بنسبت لاکھ رمضان کا ثواب لکھا جائے گا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ذکر فرمایا کہ حضرت ابن عباس حضرت ابن مسعود رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْھُمَا اور امام مجاہد، امام احمد بن حنبل رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْھما اور دوسرے حضرات کا مذہب یہ ہے کہ مکہ معظمہ میں ایک گناہ بھی لاکھ گناہ کے برابر ہے۔ ظاہر ہے کہ بادشاہ کے روبرو اس کے دربار میں اس کی حکم عدولی جتنی سنگین ہے، اتنی بادشاہ کے دربار کے باہر سنگین نہیں۔[1]

واللہ اعلم عزوجل **و رسولہ اعلم** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

19 ذو الحجۃ الحرام 1444ھ/08 جولائی 2023ء

فتوی 66:

مقدس مقامات کی طرف پیٹھ کرکے تصویریں ویڈیو بنانا کیسا؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ آج کل حرمین شریفین میں حاضری دینے والے بہت سے زائرین خانہ کعبہ اور روضۂ رسول کی طرف پیٹھ کرکے ویڈیوز بناتے اور تصاویر لیتے ہیں۔ شریعت مطہرہ کی روشنی میں ان مقدس مقامات کو پیٹھ کرکے ویڈیوز یا تصاویر بنانا کیسا ہے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

1...۔(نزھۃ القاری شرح بخاری، جلد02، صفحہ710، مطبوعہ فرید بک سٹال، لاھور)

کعبۂ مُعظمہ مُشرفہ شعائرُاللہ سے ہے اوراس کی تعظیم وادب شرعاًمطلوب و محمود ہے، لہٰذا خانۂ کعبہ کو پیٹھ کرکے ویڈیو بنانا یا تصاویر بنانا، یہ بے ادبی ہے کہ ادب وبے ادبی اور تعظیم و بے تعظیمی کا دارومدار شہروں اور لوگوں کے عرف وعادت پرہے اور کعبۂ مُشرفہ کی طرف پیٹھ کرکے یہ کام کرنا عرف میں بے ادبی سمجھا جاتا ہے۔اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مُطہرہ پر مُواجہہ شریف وسنہری جالیوں کی طرف پیٹھ کرکے ویڈیو یا تصویر بنانا بے ادبی اور بے باکی ہے کہ یہ وہ بارگاہ ہے، جہاں ادب و تعظیم کا یہ انداز بتایا گیا کہ یوں کھڑا ہو، جیسا نماز میں کھڑا ہوتا ہے اوراپنا منہ ان کی طرف رکھے، اگرچہ پیٹھ قبلہ کو ہوجائے اور علمائے اسلام رحمہم اللہ نے بلا مجبوری مزار اقدس کی طرف پیٹھ کرنے کو سختی سے منع فرمایا، حتی کہ نماز جیسی عظیم عبادت میں بھی پیٹھ نہ کرنے کا درس ارشاد فرمایا۔

امام اہل سنت اعلی حضرت الشاہ احمد رضا خان علیہ رحمۃ الرحمن تحریر فرماتے ہیں: ”بیشک تعظیم منسوب بلحاظ نسبت تعظیم منسوب الیہ ہے۔ **اور بیشک کعبہ شعائر اللہ سے ہے تو تعظیم غلاف، تعظیم کعبہ و تعظیم شعائر اللہ، شرعاًمطلوب۔**“[(1)]

امام اہل سنت مجدد دین وملت الشاہ امام احمد رضا خان علیہ رحمۃ الرحمٰن ارشاد فرماتے ہیں: ” تعظیم و بے تعظیمی میں بڑا دخل عُرف کو ہے۔ محقق علی الاطلاق ” فتح القدیر“ میں فرماتے ہیں:”یحال علی المعھود“ یہ معاملہ عرف اور رواج کے حوالے کیا جاتا ہے۔“[(2)]

سیدی امام احمد رضا خان علیہ الرحمۃ تحریر فرماتے ہیں:” قاعدہ مسلمہ مرعیہ عقلیہ شرعیہ

1...(فتاوی رضویہ، جلد22، صفحہ343، رضافاؤنڈیشن، لاہور)

2...(فتاوی رضویہ، جلد23، صفحہ391، رضافاؤنڈیشن، لاہور)

سے معلوم کہ توہین و تعظیم کا مدار عُرف و عادت ناس و بلاد پر ہے۔"[(1)]

روضۂ مطہرہ کو پیٹھ نہ کرے، اس کے متعلق حضرت علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ "منسک متوسط" کی شرح" مسلك متقسط "میں تحریر فرماتے ہیں:"(لا يستدبر القبر المقدس) ای فی صلاۃ ولا غیرھا الا لضرورۃ ملجئۃ الیہ" (مزار اقدس کی طرف پشت نہ کرے) نماز اور غیر نماز میں البتہ جب کوئی مجبوری و ضرورت ہو، تو کوئی حرج نہیں۔[(2)]

سیدی امام احمد رضا خان علیہ الرحمۃ تحریر فرماتے ہیں:"بلا مجبوری مزار اقدس کو پیٹھ کرنے سے منع فرمایا، اگرچہ نماز میں ہو۔"[(3)]

صدر الشریعہ بدر الطریقہ مفتی امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ تحریر فرماتے ہیں:" قبر کریم کو ہر گز پیٹھ نہ کرو اور حتی الامکان نماز میں بھی ایسی جگہ نہ کھڑے ہو کہ پیٹھ کرنی پڑے۔"[(4)]

فتاوی رضویہ میں حضور علیہ الصلوۃ و السلام کی بارگاہ کی حاضری کے آداب میں ہے:"اب کمال ادب و ہیبت و خوف و امید کے ساتھ زیر قندیل اس چاندی کی کیل کے جو حجرہ مطہرہ کی جنوبی دیوار میں چہرہ انور کے مقابل لگی ہے، کم از کم چار ہاتھ کے فاصلہ سے قبلہ کو پیٹھ اور مزار انور کو منہ کرکے نماز کی طرح ہاتھ باندھے کھڑے ہو، لباب و شرح لباب و اختیار شرح مختار، فتاوائے عالمگیری وغیرہا معتمد کتابوں میں اس کی تصریح فرمائی کہ" يقف كمافي الصلوة"حضور کے سامنے ایسا کھڑا ہو جیسے نماز میں کھڑا ہوتا ہے، یہ عبارت عالمگیری و اختیار کی ہے۔ اور لباب

1...(فتاوی رضویہ، جلد07، صفحہ315، رضا فاؤنڈیشن، لاھور)

2...(مسلک متقسط مع ارشاد الساری، باب زیارت سید المرسلین ﷺ، ص342، بیروت)

3...(فتاویٰ رضویہ، جلد07، صفحہ302، رضا فاؤنڈیشن، لاھور)

4...(بھار شریعت، جلد1، صفحہ1228، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

میں فرمایا: ”وَاضِعًا یَمِیْنِہ عَلٰی شِمَالِہٖ“ دست بستہ دہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر کھڑا ہو۔“[1]

محبوبانِ بارگاہِ خدا کے آداب کے بارے میں فتاوی رضویہ میں ہے: ”ہنگام توسل محبوبان خدا کی طرف منہ کرنا چاہیے، اگرچہ قبلہ کو پیٹھ ہو اور دل کو ان کی طرف خوب متوجہ کرے یہاں تک کہ ہر این وآں خاطر سے محو ہو جائے اور ان کے لئے خضوع و خشوع محمود و مشروع اور اس میں ان کا زمانہ وفات ظاہری و حضور مرقد و ذکر مجرد سب برابر ہے اور ان کے سوا عبارات اخیرہ سے جو اور فوائد جمیلہ و عوائد جلیلہ حاصل ہوئے، بیان سے غنی ہیں۔“[2]

و اللہ اعلم عزوجل و رسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبــــــــــــــــــــہ

مفتی ابو الحسن محمد ہاشم خان عطاری

20شعبان المعظم1440ھ/26اپریل 2019ء

فتویٰ67:

غلاف کعبہ سے ٹکڑا نکالنا کیسا؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ زید عمرہ کرنے گیا، وہاں اس نے غلاف کعبہ کا ٹکڑا اتار لیا۔ تو کیا زید غلاف کعبہ کا ٹکڑا تبرک کے طور پہ پاکستان لا سکتا ہے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوھاب اللھم ھدایۃ الحق و الصواب

بیان کی گئی صورت میں زید غلاف کعبہ کا ٹکڑا اتارنے کی وجہ سے گنہگار ہوا، اس پر لازم

1...(فتاوی رضویہ، جلد10، صفحہ765، رضافاؤنڈیشن، لاھور)

2...(فتاوی رضویہ، جلد07، صفحہ602، رضافاؤنڈیشن، لاھور)

ہے کہ اس سے توبہ کرے اور وہ ٹکڑا کسی فقیر کو دے دے۔

اس مسئلہ کی تفصیل:

شرعی قوانین کی رو سے جو غلاف چڑھا ہوا ہے، اس میں سے کچھ لینا ناجائز و گناہ ہوتا ہے اور اگر کوئی لے لے اس کو حکم ہے کہ توبہ کرے اور یہ ٹکڑا واپس غلاف میں لگائے، لیکن آج کل واپسی کی صورت ممکن نہیں ہے، تو حکم ہو گا کہ کسی فقیر کو دے دے، جیسا کہ اگر غلاف کعبہ کا کوئی حصہ جدا ہو کر گر پڑے اور کوئی اسے اٹھالے فقیر کو دینے کا حکم ہوتا ہے۔

النتف للفتاوی میں ہے: ”لا یجوز ان یأخذ من کسوۃ الکعبۃ شیئا فان اخذہ ردہ الیھا واما ما سقط منھا فیعطی الفقراء“ ترجمہ: غلاف کعبہ میں سے کچھ لینا جائز نہیں ہے، اگر لیا تو وہ واپس کرے، اور جو غلاف کعبہ سے ٹکڑا جدا ہو جائے، تو وہ فقیر کو دے دے۔[1]

مفتی امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”جو غلاف چڑھا ہوا ہے اس میں سے لینا جائز نہیں بلکہ اگر کوئی ٹکڑا جدا ہو کر گر پڑے، تو اسے بھی نہ لے اور لے تو کسی فقیر کو دیدے۔“[2]

واللہ اعلم عزوجل ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبــــــــــــــــــــــــہ

مفتی ابو الحسن محمد ھاشم خان عطاری

03 ربیع الآخر 1445ھ/19 اکتوبر 2023ء

فتوی 68:

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں مستقل رہائش رکھنا کیسا؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ مدینہ منورہ

1...(النتف للفتاوی، جلد1، صفحہ222، دار الفرقان، بیروت)

2...(بہار شریعت، جلد1، صفحہ1151، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

میں مستقل رہائش رکھنے کے متعلق کیا شرعی حکم ہے؟ ہم نے ایک چینل پر کسی معتبر عالم دین سے اِس کی ممانعت سنی ہے، جبکہ دوسری طرف یہ روایت بھی موجود ہے کہ تم میں سے جس سے ہو سکے، وہ مدینہ منورہ میں مرے، کہ یہاں مرنے والوں کی میں شفاعت کروں گا۔ (الحدیث) دونوں میں کیا تطبیق ہو گی؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملك الوهاب اللهم هداية الحق و الصواب

انسانی طبیعت یہ ہے کہ کسی جگہ مستقل سکونت اختیار کرنے سے گزرتے وقت کے ساتھ دل میں اُس جگہ کی اہمیت کم ہوتی جاتی ہے، اِسی مزاجِ انسانی کے سبب فقہائے کرام نے یہ حکم ارشاد فرمایا کہ مکہ و مدینہ میں مستقل رہائش اختیار کرنا شرعاً ممنوع ہے، کیونکہ مستقل رہائش کی صورت میں وہاں کے آداب کی پرواہ، قلبی محبت، اُن شہروں کی عظمت اور اُس عظیم بارگاہ سے لگاؤ میں کمی آئے گی، نیز مکہ مکرمہ میں ایک گناہ ایک لاکھ گناہ کے برابر ہے، لہذا اِن تمام حکمتوں کے پیشِ نظر فقہائے کرام نے مطلقاً ممانعت کا حکم صادر فرمایا۔

جہاں تک حدیث مبارک میں مدینہ شریف میں موت اور ضمناً اُس کے متعلقات یعنی اقامت اور توطُّن کا حکم دیا گیا، وہاں بھی یہ اجازت ان لوگوں کے لیے ہے، جو یہاں رَہ کر اِس مقامِ عظیم کا حق ادا کرنے کی استطاعت رکھتے ہوں، وہ یہاں رہیں اور یہیں پر انتقال کریں اور حقیقت یہ ہے کہ ایسی استطاعت بہت ہی کم افراد کو ہوتی ہے اور فقہی ضابطہ ہے کہ "قلیل" پر نظر کرتے ہوئے احکامِ فقہیہ کی بنیاد نہیں رکھی جاتی، لہذا فقہائے کرام نے مطلقاً منع کا حکم ہی دیا۔ البتہ جن بزرگانِ دین نے مدینہ منورہ میں مستقل سکونت اختیار فرمائی، اُن کے بارے میں یہی کہا جائے گا

کہ اُنہوں نے یقیناً وہاں رہ کر بھی اپنے سوزِ عشق اور احترام و تعظیم میں کسی طرح کمی نہیں آنے دی، جیسا کہ اُن کے واقعات وحالات سے واضح ہے، لہٰذا اُن کے حق میں حکمِ ممانعت بھی نہیں تھا۔

روایت اور اُس کی شرح:

مدینہ منورہ میں انتقال پر شفاعتِ مصطفیٰ صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی بشارت ہے، چنانچہ امام ترمذی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (وِصال:279ھ/892ء) روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: ”من استطاع أن يموت بالمدينة فليمت بها، فإني أشفع لمن يموت بها“ ترجمہ: جس سے ہو سکے کہ وہ مدینہ منورہ میں انتقال کرے، تو اُسے چاہیے کہ وہ وہیں انتقال کرے کہ جو مدینہ منورہ میں وفات پائے گا، میں اُس کی شفاعت کروں گا۔[(1)]

اس روایت کے تحت نور الدین علامہ علی قاری حنفی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (وِصال:1014ھ/1605ء) نے لکھا: ”لذا قيل الأفضل لمن كبر عمره أو ظهر أمره بكشف ونحوه من قرب أجله، أن يسكن المدينة ليموت فيها“ ترجمہ: اِسی لیے کہا گیا کہ جس کی عمر زیادہ ہو چکی ہو یا کشف وغیرہ سے موت کا قریب ہونا معلوم ہو جائے، تو وہ مدینہ منورہ میں سکونت رکھ لے تا کہ وہیں پر انتقال کرے۔[(2)]

مگر رہائش جملہ آدابِ حرمین اور دیگر شرائط کے ساتھ مشروط ہے، چنانچہ علامہ عبد الرؤف مُناوی رَحْمَۃُ اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (وِصال:1031ھ/1621ء) لکھتے ہیں: ”أخذ منه حجة الإسلام

1...(سننِ الترمذی، جلد06، باب ما جاء فی فضل المدینۃ، صفحہ203، دار الغرب الاسلامی، بیروت)

2...(مرقاۃ المفاتیح، جلد05، کتاب الحدود، صفحہ1884، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، لبنان)

ندب الإقامة بها مع رعاية حرمتها وحرمة ساكنيها وقال ابن الحاج: حثه على محاولة ذلك بالاستطاعة التي هي بذل المجهود في ذلك" ترجمہ: اِس روایت سے حجۃ الاسلام رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ نے مدینہ منورہ میں سکونت کے استحباب کو اخذ کیا، مگر وہ سکونت مدینہ منورہ اور اُس کے رہائشیوں کے آداب واحترام بجالانے سے مشروط ہے۔ علامہ ابن الحاج رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ نے فرمایا: نبی اکرم صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے مدینہ منورہ میں انتقال کرنے کی کوشش پر ابھارا ضرور ہے، مگر اُسے ایسی استطاعت سے مشروط رکھا ہے، جس کے لیے خوب ہمت اور کوشش صَرف کرنے کی ضرورت ہے۔[1]

مستقل رہائش رکھنے پر فقہاء کا کلام:

امام ابنِ ہُمَّام رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ (وِصال:861ھ/1456ء) لکھتے ہیں: "اختلف العلماء في كراهة المجاورة بمكة وعدمها۔۔۔ذهب أبو حنيفة ومالك رحمهما الله إلى كراهتها۔۔هذا أحوط لما في خلافه من تعريض النفس على الخطر إذ طبع الإنسان التبرم والملل من توارد ما يخالف هواه في المعيشة وزيادة الانبساط المخل بما يجب من الاحترام لما يكثر تكرره عليه ومداومة نظره إليه۔۔۔وعلى هذا فيجب كون الجوار في المدينة المشرفة كذلك، فإن تضاعف السيئات أو تعاظمها وإن فقد فيها فمخافة السآمة وقلة الأدب المفضي إلى الإخلال بواجب التوقير والإجلال قائم. وهو أيضا مانع إلا للأفراد ذوي الملكات فإن مقامهم وموتهم فيها هي السعادة الكاملة۔۔۔أخرج الترمذي وغيره عن ابن عمر عن النبي صلى الله عليه وسلم «من استطاع أن يموت بالمدينة فليمت فإني أشفع لمن يموت بها" ترجمہ: علمائے کرام کا مکہ

1...(فیض القدیر، جلد06، صفحہ53، مطبوعہ دارالمعرفہ، بیروت)

مکرمہ میں مستقل سکونت رکھنے کے مکروہ ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف ہے۔ امام اعظم اور امام مالک رَحْمَةُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِما کا مسلک یہ ہے کہ مستقل سکونت مکروہ ہے۔ یہ قول نہایت محتاط ہے، کیونکہ اِس کے بر خلاف یعنی عدمِ کراہت کا قول کہنے میں اپنے آپ کو خطرے پر پیش کرنے والی بات ہے، کیونکہ زندگی میں مسلسل انسانی خواہشات کی مخالفت کرنے سے قلبی ملال اور پریشانی پیدا ہوتی ہے۔ اِسی طرح مستقل رہائش کی صورت میں زیادہ بے تکلفی سامنے آئے گی، جو قلبی احترام میں خلل پیدا کرے گی، کیونکہ وہ بار بار حرم مقدس میں آئے گا، کثرت اور تسلسل سے زیارتِ کعبہ مشرفہ کرے گا۔ **اِس ساری گفتگو کی بنیاد پر مدینہ منورہ میں مستقل سکونت کا حکم بھی یہی ہے۔ اگرچہ مدینہ طیبہ میں ایک گناہ کا کئی گُنا ہونا مفقود ہے، لیکن پھر بھی وہاں مسلسل رہائش رکھ کر اُکتاہٹ اور ادب میں کمی آنے کا خوف موجود ہے، جو کہ وہاں کے احترام، توقیر اور عظمت وجلالت میں کمی پیدا کرے گا، لہذا جب یہ علت قائم ہے، تو یہ بھی "مجاورت" سے مانع ہونے کو کافی ہے۔**[1]

مگر پھر قولِ کراہت سے استثناء کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "إلا للأفراد ذوي الملكات فإن مقامهم وموتهم فيها هي السعادة الكاملة۔۔۔أخرج الترمذي وغيره عن ابن عمر عن النبي صلى الله عليه وسلم «من استطاع أن يموت بالمدينة فليمت فإني أشفع لمن يموت بها" ترجمہ: ہاں وہ فرشتہ صفت افراد کہ جو وہاں کا حقیقی احترام مسلسل رکھ سکیں، اُن کا وہاں رہائش رکھنا اور وہیں انتقال کرنا، یقیناً عظیم اور کامل سعادت ہے۔ امام ترمذی رَحْمَةُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ و غیرہ نے حضرت ابنِ عمر رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُمَا سے روایت کیا: جس سے ہو سکے کہ وہ مدینہ منورہ میں

1...(فتح القدیر، جلد03، المقصد الثانی فی المجاورۃ، صفحہ178، مطبوعہ مصر)

انتقال کرے، تو اُسے چاہیے کہ وہ وہیں انتقال کرے کہ جو مدینہ منورہ میں وفات پائے گا، میں اُس کی شفاعت کروں گا۔[1]

یہاں غور کیجیے کہ علامہ ابنِ ہمام رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ نے "حدیثِ ترمذی" کو بالخصوص اُن لوگوں کے حق اور تائید میں نقل کیا، جو وہاں رہ کر آداب کا خیال رکھ سکیں، مگر پھر اِس استثناء کے بعد خود ہی حقیقتِ حال کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھا: "لكن الفائز بهذا مع السلامة من إحباطه أقل القليل، فلا يبنى الفقه باعتبارهم ولا يذكر حالهم قيدا في جواز الجوار" ترجمہ: لیکن گناہوں کی دلدل میں پھنسنے اور سلامتی کے ساتھ کامیاب ہونے والے بہت ہی کم ہوتے ہیں اور تھوڑے افراد کو بنیاد بنا کر فقہی احکامات مرتب نہیں ہوتے اور نہ ہی مجاورت کا جواز ثابت کرنے کے لیے اُن مستثنیٰ لوگوں کے احوال کو بطورِ قیدِ احترازی بیان کیا جائے گا۔[2]

بالآخر مسئلہ شرعیہ کا نتیجہ نکالتے ہوئے لکھتے ہیں: "وكل من هذه الأمور سبب لمقت الله تعالى، وإذا كان هذا سجية الشر فالسبيل النزوح عن ساحته، وقَلَّ من يطمئن إلى نفسه في دعواها البراءة من هذه الأمور إلا وهو في ذلك مغرور" ترجمہ: یہ تمام چیزیں (قلتِ ادب واحترام وغیرہا) اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا باعث ہیں اور جب ایسی طبیعتِ شر، بشری تقاضوں میں شامل ہے، تو بچنے کی صورت فقط اس میدان سے نکل جانا ہی ہے اور ان امور سے بچنے کا دعویٰ کرنے والے بہت تھوڑے ہیں اور جو وہ "تھوڑے" ہیں، در حقیقت وہ نفس کے دھوکے میں ہیں۔[3]

"صاحبِ فتح القدیر" کی اس مکمل بحث پر تبصرہ کرتے ہوئے امامِ اہلِ سنَّت، امام احمد رضا

1...(فتح القدیر، جلد03، المقصد الثانی فی المجاورۃ، صفحہ179، مطبوعہ مصر)

2...(فتح القدیر، جلد03، المقصد الثانی فی المجاورۃ، صفحہ179، مطبوعہ مصر)

3...(فتح القدیر، جلد03، المقصد الثانی فی المجاورۃ، صفحہ178، مطبوعہ مصر)

خان رَحْمَةُ اللهِ تَعَالٰی عَلَیْهِ (وصال:1340ھ/1921ء) نے لکھا: ”وھو کما تری من الحسن بمکان فقد افادوا جاد، اثابه الجواد تبارک وتعالی، وابان ان الامر وان کان فی الواقع علی جواز الجوار بشرط التوثیق وھو التوفیق عندالتحقیق کما نص علیه وصححه فی شرح اللباب وجزم به فی الدرالمختار الا ان اھل التوثیق لما کانوا اقل قلیل واحکام الفقه انما تبتنی علی الغالب الکثیر دون النادر الیسیر فالوجه ھواطلاق المنع کما ھو مذھب الامام رضی اللہ تعالی عنه و لذا اخذ الفاضلون المحشون العلامة الحلبی ثم الطحطاوی ثم الشامی کلھم فی حواشی الدر، فی اشتراطه التوثیق حیث نقلوا کلام الفتح، ثم قالوا وھو وجیه، فکان ینبغی للشارح ان ینص علی الکراھة ویترک التقلید بالتوثیق“ ترجمہ: آپ نے دیکھا کہ اِس جگہ محقق نے کتنا خوبصورت کلام فرمایا ہے۔ نہایت ہی عمدہ اور جید اِفادات فرمائے ہیں۔ خدائے جَوَّاد اُنہیں خوب اجر عطا فرمائے۔ انہوں نے واضح فرمادیا کہ اگرچہ مجاورت کا معاملہ جائز ہے، مگر بشرطِ توثیق جو کہ بصورتِ توفیق الٰہی ہی حاصل ہو سکتی ہے، جیسا کہ انہوں نے تصریح کی، نیز ”شرح اللباب“ میں اس کو صحیح کہا، ”الدرالمختار“ میں اسی پر جزم کا اظہار کیا، مگر چونکہ اہلِ توثیق بہت ہی کم ہوتے ہیں اور احکام فقہ کی بنیاد نادر اور قلیل پر نہیں ہوتی، بلکہ غالب کثیر پر ہوتی ہے، **تو اب مطلقاً منع کہنا ہی بہتر ہے، جیسا کہ امام اعظم رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْه کا مذہب ہے،** یہی وجہ ہے کہ ”درمختار“ پر حواشی لکھنے والے فاضل علماء مثلاً: علامہ حلبی، علامہ طحطاوی اور پھر علامہ شامی رَحْمَةُ اللهِ تَعَالٰی عَلَیْهِم سب نے ”فتح القدیر“ کی عبارت نقل کرکے ”توثیق“ کی شرط لگائی اور پھر لکھا: یہی قول بہتر ہے، لہٰذا شارح (علامہ حصکفی رَحْمَةُ اللهِ تَعَالٰی عَلَیْهِ) کو چاہیے تھا کہ وہ کراہت پر تصریح کرتے اور توثیق کی قید کو چھوڑ دیتے۔ (یعنی توثیق کی قید لگائے بغیر مطلقاً کراہت کا قول بیان کرتے۔)“[1]

1...(فتاوی رضویہ، جلد10، صفحہ695، مطبوعہ رضافاؤنڈیشن، لاہور)

اپنی تحقیق کے آخر میں اعلیٰ حضرت رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ نے نتیجہ بیان کرتے ہوئے لکھا: ”بالجملة فالحکم عدم جواز الجوار اصلا فی زماننا“ ترجمہ: تمام تحقیق کا ایک جملے میں حاصل یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں مکہ و مدینہ زَادَھُمَا اللہُ شَرَفاً و تعظیماً میں مستقل سکونت اختیار کرنے کی اجازت نہیں۔“[1]

اِس مسئلے کی مزید تحقیق اور تفصیل جاننے کے لیے اعلیٰ حضرت رَحْمَۃُاللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ کے رسالے ”صَیْقَلُ الرَّیْن عَن اَحْکَامِ مُجَاوَرَۃِ الحَرَمَیْن“ کا مطالعہ کیجیے۔ یہ رسالہ فتاویٰ رضویہ کی دسویں جلد میں موجود ہے۔

واللہ اعلم عزوجل و رسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کتبـــــــــــــــــــــــہ

مفتی محمد قاسم عطاری

22محرم الحرام1446ھ/29جولائی2024ء

---

1 ...(فتاویٰ رضویہ، جلد10، صفحہ698، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاھور)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”حدیث پاک“

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

”اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَلْعُمْرَۃُ اِلَی الْعُمْرَۃِ کَفَّارَۃٌ لِمَا بَیْنَہُمَا، وَالْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَیْسَ لَہٗ جَزَاءٌ اِلَّا الْجَنَّۃُ“ ترجمہ: ایک عمرہ، دوسرے عمرے تک اپنے درمیان ہونے والے گناہوں کا کفارہ ہے اور حج مبرور کی جزا صرف جنت ہے۔

(صحیح البخاری، ابواب العمرۃ، جلد 3، صفحہ 2، مطبوعہ دار طوق النجاۃ)

فیضان مدینہ، محلہ سوداگران، پرانی سبزی منڈی کراچی

+92 21 111 25 26 92 0313-1139278

www.maktabatulmadinah.com / www.dawateislami.net

feedback@maktabatulmadinah.com / ilmia@dawateislami.net